

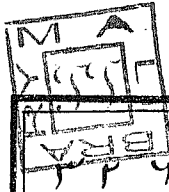
M.A.LIBRARY, A.M.U.



U32608

*Handwritten signature or mark*

CHECKED-2002



# انتساب

”ایوان اشاعت“ اپنی اس کتاب کے صدقیت  
اور خلوص جذبات کے ساتھ جناب سید ضامن علی صاحب  
رئیس گورکھپور کے نام پر معنون کرتا ہے جن کو اسکے ساتھ  
سچی ہمدردی ہے اور جنگی اعانت کو اس کا سنگ بنیاد  
کھنا چاہئے۔

سکرٹری

ایوان اشاعت

گورکھپور

9 10 11 12 13

14 15

16 17 18

19 20 21

(الف)

## عنوانات

صفحہ	عنوان
۱۱ - ۱ ...	وَرگاوُتی
۲۶ - ۱۲ ...	چاندنی بی
۴۴ - ۲۶ ...	تارا بابی
۵۶ - ۴۵ ...	پتا
۷۷ - ۵۸ ...	سجھوگتا
۹۳ - ۷۷ ...	پدمنی
۱۰۶ - ۹۴ ...	ایہیہ بابی



(ب)

## تمہید

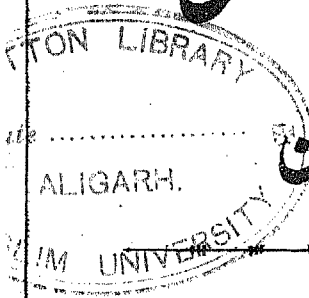
اس کتاب کی ترتیب تدوین میں جناب سٹر  
شرف الدین بی بی، بی بی، بی بی نے جو مدد دی ہے یوان  
اشاعت اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔

انہوں نے ہندوستان کی مشہور اور مستند تاریخوں  
اور متعدد درسی کتابوں سے مواد فراہم کر کے یوان اشاعت  
کو دئے۔ جنکو حذف و اضافہ اور ترمیم و تصحیح کے بعد اس صورت  
میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے طلبہ اور خواتین اس کتاب  
کو دلچسپی سے پڑھیں گی اور اس سے کما حقہ بہرہ مند ہوں گی

سکرٹری  
یوان اشاعت  
گواکھپور

ہندوستان

بہادر عورتیں



(۱)  
رانی دُرگاوٹی

دکن کے پہاڑی علاقوں میں ایک چھوٹی سی ریاست  
گوئڈوانہ تھی جسکی راجدھانی گڑھ تھی۔ زیادہ تر اُس میں راجپوتوں  
کی جفاکش اور بہادر قوم آباد تھی۔ راجہ دالپت سنگھ اُن کا سردار  
تھا۔ وہ بہادری میں کیتا تھا۔ رعایا بھی اُس کو بہت مانتی تھی  
اُس کی رانی دُرگاوٹی ایک مشہور راجپوت اجہ کی بیٹی تھی۔

گوٹھوانہ ایک خود مختار ریاست تھی جس نے آج تک بھی  
 کسی کا لوہا نہ مانتا تھا۔ راجہ بھی منوچی کے قدم بقدم چلتا تھا۔  
 وہ دور اندیشی و انصاف کا پتلا تھا۔ رعایا آسودہ اور خوشحال  
 تھی۔ لوگ مختلف پیشوں پر بسر وقات کرتے تھے۔ ملک میں کوئی  
 فتنہ تھا نہ کوئی فساد۔ ہر طرح امن و امان تھا۔ چین اور سکھ کی نیند  
 سوتے اور اپنا کام آزادی کے ساتھ انجام دیتے۔ فلک بھر قمار  
 چین اور سکھ دیکھا نہ گیا۔ راجہ والپت سنگھ کو عین شباب میں موت  
 کے ظالم ہاتھوں نے رعایا سے جدا کر دیا۔ بیچاری دُرگا ونی بیوہ  
 ہو گئی۔ اُس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا جس کا نام وینارائن  
 تھا۔ محض ملک و بچہ کی خاطر دُرگا ونی کو سستی کے خیال سے  
 باز رہنا پڑا۔ وہ مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ راج چاٹ کا  
 کام دیکھنے لگی۔ لوگ اب واپت سنگھ کے زمانہ کو بھول گئے،  
 اور رانی دُرگا ونی کے گیت گانے لگے۔

سولہویں صدی آدھی سے زیادہ ثبت چکی تھی۔ دہلی کے  
تخت پر اکبر اعظم رونق افروز تھا۔ ہندوستان میں چاروں طرف فتح  
کا نعرہ بلند تھا۔ مقبوضات میں ضافہ ہو رہا تھا۔ اکبر کی نظر گوندوانہ  
پر بھی پڑی جس کی مالک ایک عورت تھی۔ اکبر کا سہیل لار  
اصف خاں کچھ کم حوصلہ والا نہ تھا۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ گوندوانہ  
کو زیر کر کے لے گا۔

مُغلوں کے حملہ کی خبر مل گوندوانہ کے کانوں میں پڑی۔ خبر  
کا ہے کہ کتنی ایک گ تھی جو پل مالے تے ٹکا کے چپے چپے میں پھیل گئی  
لوگوں کو بھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ ہم اس مصیبت میں گرفتار ہونگے۔  
وہ نہ تو کسی پڑوسی سلطنت سے لڑتے بھڑتے تھے اور نہ خوں نیری کو اچھا  
سمجھتے تھے۔ امن کی زندگی تھی۔ کسی سے کوئی سُکر کار نہ تھا۔ مُغلوں  
کے حملہ کی خبر نے سب کو سراسیمہ کر دیا۔ حیران تھے کہ ہم مٹھی بھر راجپوت  
مُغلوں کی بے شمار فوج کا کیوں کر مقابلہ کریں گے۔ وہ ناامید و ردِ شکستہ



تو پہلے تھے مگر ہمت اور قومی جوش میں کمی نہ تھی۔  
 انھوں نے عہد کر لیا کہ ملک کی بھینٹ چڑھ جانا ذلت اور  
 غلامی کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ رانی دُرگاوتی نے دل بڑھا  
 اور کہا "بہادرو! جب تک اچوتی خون رگوں میں لہریں لے رہا  
 ہے کروں جھکانا تو درکنار اسکا خیال کرنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔  
 تم بھی مرٹو مگر خونخوار مغلوں کے آگے ہتھیار نہ ڈالو۔" انجام جو کچھ بھی  
 ہو دُرگاوتی نے مقابلہ کی ٹھان لی تھی، اور اپنے سوراؤں کی  
 ثابت قدمی اور جوانمردی سے مٹھن تھی۔ جیوں ہی مسلح ہو جانے کا  
 حکم رعایا کو ملا وہ جوش میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ملک کے نوجوان کھڑے  
 اور سر کو ہتھیلی پر لے کر لڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ تھوڑے عرصہ  
 کے بعد فوج تیار ہو گئی۔ عورتیں اور بچے بھی اس مہم میں کسی سے  
 پیچھے نہ رہے۔ دوش بدوش میدان جنگ میں لڑنے کے لئے  
 آمادہ تھے۔ دُرگاوتی سپہ سالار بنی اور میدان میں مغلوں کا انتظا

کرنے لگی۔ اُن لوگوں کے دلوں میں یہ بات سچا چکی تھی کہ ظالم  
مُغلوں کے حملہ کو ہم ضرور روک لیں گے اور اپنے ملک اور اپنی  
آزادی پر حرف نہ آنے دیں گے۔ ہر شخص اپنی بہادری کا جوہر  
دکھانے کے لئے بے چین تھا۔

آصف خاں مُغلوں کا سپہ سالار تھا۔ وہ اس خیال میں  
تھا کہ بھلا عورت ذات اُسکے سامنے کیا ٹھہریگی۔ چھوٹی سی  
سلطنت بھلا کارزار کے ہاتھ آجائے گی۔ جب مقابلہ کی ٹھہری تو  
مُغلوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ بہادر راجپوت مقابلہ کے لئے  
شمشیر تول رہے تھے۔ اپنے زعم میں آصف خاں فوج بھی زیادہ  
نہ لایا تھا۔ ایک مختصر سالہ تھا جو اب آنکھ کھلنے پر محض کافی  
نظر آنے لگا۔

آخردہلی سے فوج طلب کی گئی۔ آصف خاں نے اس  
اتنا میں ایک شخص کو کچھ پیغام دیکر رانی کے پاس بھیجا۔ پیامبر

سامنے بلایا گیا تو اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”غیرت دار اور شریف  
 رانی! میں آصف خاں کی طرف سے آیا ہوں، وہ اکبر اعظم کی فوج  
 کا سپہ سالار ہے۔ یہ پیام گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ مغل نہ تو لڑنے  
 کے لئے تیار ہیں اور نہ آپ کو نقصان پہنچانے کی نیت سے آئے  
 ہیں۔ ہاں اتنا چاہتے ہیں کہ اپنے لڑکے کو شہنشاہ کے سپرد کیجئے  
 اور اُسے اپنا مہاراجہ تسلیم کر لیجئے پھر ساری فوج واپس چلی جائیگی  
 اور آپ کا راج پاٹ برقرار رہے گا۔“

قبل اسکے کہ سپاہبرائینا آخری جملہ تمام کرے درگاوتی غصہ  
 میں کانپتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور کڑک کر بولی۔ ”اپنے سردار سے  
 کلمہ و خیال بھی دل میں نہ لئے کہ ہم راجپوت مغلوں کی فوج کو  
 دیکھ کر ڈرجائینگے۔ سامنے میدان جنگ ہے اب ہیں فیصلہ ہوگا کہ ہم  
 اکبر کو شہنشاہ تسلیم کریں گے یا آزاد رہیں گے۔“ یہ کہہ کر سپاہبر کو  
 دربار سے رخصت کر دیا۔

آصف خاں کو یہ جواب سُکر خیریت ہوئی اُسے کیا معلوم  
 تھا کہ رانی اپنی مختصر فوج لیکر مُغلوں کے لشکرِ عظیم کا مقابلہ کرنے  
 پر تُل جائیگی۔ دہلی سے فوج آگئی تھی مُغلوں نے گڑھ کی طرف  
 قدم بڑھائے۔ راجپوت بھی آگے بڑھے مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں  
 طرف تلواریں چلنے لگیں۔ رانی کے جسم پر بے کی زرہ چمک رہی  
 تھی۔ سرِ بخود تھی جسکی جھلک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ تلوار ہاتھ  
 میں تھی اور ایک سفید گھوڑے پر سوار تھی۔ آصف خاں اپنی کٹھن  
 دنگ ہ گیا اُسکے ہر وار پر اسکی زبان سے بے ساختہ واہ نکل  
 جاتی تھی۔ سوار اور پیادل دونوں رانی میں گتھے گئے۔ رانی بھی  
 تلوارِ موت کو دوڑی، آفا فانا نہ جانے کتنے مُغلوں کو تلوار کے  
 گھاٹ اُتار دیا۔ اُسے دیکھ کر راجپوتوں کا دل بڑھتا رہتا، مگر مُغل  
 کانپ کانپ اُٹھتے تھے۔ وہ رہ رہ کر نعرہ لگا رہی تھی۔ ”میرے  
 بہادر سپاہیو! بڑھو! بڑھو! اپنی عزت اپنے نمک کے لئے تلوار

چلاؤ! پیدل اور سوار دونوں کامیاب ہیں۔ کوئی حملہ کر دیتا تو کوئی تو اڑھٹا تا جلد ہی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ مغلوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان راجپوتوں کے ہاتھ رہا۔ دُرگاوتی نے زہ اور خود اُتار کر دُرگا دیوی کے آگے سجدہ شکر ادا کیا اور اپنے محل میں چلی گئی۔

آصف خاں کی غیرت کیسے گوارا کرتی کہ عورت کے ہار پر چین بیٹھ رہتا۔ یہ شکست اسکے لٹے ڈوب منے کی بات تھی۔ اس سے بڑھ کر اسکی رُسوائی کیا ہو سکتی تھی کہ ایک عورت نے اسکو نیچا دکھایا۔ وہ سوچتا تھا اور مارے غیرت اور غصہ کے جھنجھاتا تھا۔ اُس نے پھر ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کیا اور دُرگاوتی کے شہر پر چڑھائی کی۔ رانی بھی غافل نہ تھی، پہلے ہی سے یہ ڈر لگا ہوا تھا۔ اُس نے بھی اپنے آدمیوں کو جمع کیا اور دشمن کے مقابلہ پر آگئی۔ اس شہ لڑائی اور بھی زیادہ گھمسان رہی۔ تمام دن کُشت و خون ہوتا رہا۔

دونوں طرف مارنے اور مرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر راجپوتوں کی  
سرفروشی اور دُرگاوتی کی ہمت نے مغلوں کے قدم ہلا دیے۔ وہ  
جس طرح آئے تھے اُسی طرح پسپا ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

آصف خاں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا، اُس کا دل ڈوبا جا رہا تھا  
مگر دُرگاوتی کے بھی بُرے دن آئے تھے۔ جو کام تلوار سے نہ ہوا  
وہ مکر اور فریب کے ذریعہ انجام پا گیا۔ مغلوں کو دوسری مرتبہ شکست  
دینے کے بعد راجپوت فتح کی خوشیاں منا رہے تھے، شہر میں چراغا  
ہو رہا تھا۔ دُرگاوتی نے دل کھول کر انعام تقسیم کیا۔ لیکن جانے  
وہ کون سی مخوس گھڑی تھی جبکہ اُس نے اپنے لڑکے ویرا راٹن کو  
فوج کا افسر بنا دیا۔ بس کیا تھا۔ کچھ راجپوت بدظن ہو گئے۔ اُن کے  
سینوں میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ کہنے لگے کہ رانی نے  
خود غرضی سے کام لیا ہے۔ اب ہاتھ سے فادار اور جاں نثار  
راجپوت نہ تھے جس اور غصہ نے انکی عقل پر پردہ ڈال دیا۔ انھوں نے

مُغلوں کو خفیہ خطوط بھیجے کہ دُرگاونی کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے، آؤ اور ملک پر حملہ کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔  
 آصف خاں تو خُدا سے چاہتا تھا کہ کسی طرح کلنک کا ٹیکا اپنی پیشانی سے دور کرے فوج لیکر قلعہ پر چڑھ آیا، اور اُنکی دُرگاونی کے اقبال نے اُسکا ساتھ نہیں دیا۔

نگہبان نے خطرہ سے جیوں ہی رانی کو آگاہ کیا، اُس نے زور اور خُود پہنی اور میدان جنگ میں اکھڑی ہو گئی۔ فوج دو حصوں تقسیم کی گئی۔ ایک ستہ کی سپہ سالاری اپنے بیٹے کے سپرد کی اور دوسرے کو خود اپنی سرکردگی میں رکھا۔ مگر حسد اور غداری کا بُرا ہو۔ لڑائی کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتا گیا۔ آخر کار جاں باز راجپوتوں اتنا دم نہ رہا کہ مُغلوں سے جہم کر لڑتے۔ اُنھوں نے دُرگاونی کو سمجھا یا کہ اب مقابلے کا رہے یہ تھکوار ڈال دینا ہی بہتر ہوگا۔ مگر رانی نے ایک نئے سُنی۔ وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ جھپٹ کر

واکر رہی تھی اور اپنے چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر لگا رہی  
 تھی۔ اسی میں ولی عہد کو ایک ایسا زخم کاری لگا کہ وہ جاں بہر  
 نہ ہو سکا۔ ماں کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ غم اور غصہ میں ہوش نہ  
 ہو اس کھوٹھی بیچ لشکر میں گھس گئی۔ اب جو سامنے آتا تھا وہ  
 تلوار کی نذر ہو جاتا تھا۔ مغلوں کے قدم اکھڑنے والے ہی تھے کہ  
 دشمن کا ایک تیرا کر اُسکی آنکھ میں بیٹھ گیا۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ  
 تیر نکال کر پھینکے، مگر ایک سپاہی نے پک کر بھالا اُسکے سینے  
 کے پار کر دیا۔ رانی درگاوتی سنبھل نہ سکی۔ گونڈوانہ کی بہادر رانی  
 زمین پر آ رہی۔ درگاوتی نے ملک اور قوم کے لئے اپنے کو قربان  
 کر دیا اور تاریخ کے صفحات میں اپنی جاں نثاری کی داستان  
 چھوڑ گئی۔ اُس کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔





(۲)

## چاند بی بی

چاند بی بی سلطانہ نظام شاہ والی احمد نگر کی بیٹی تھی وہ ۱۵۴۸ء میں پیدا ہوئی۔ ابھی بالکل کمسن تھی کہ اُسکی تربیت شروع ہو گئی اور اچھے بُرے کی تعلیم دی جانے لگی۔ پاک باطنی اور سچائی کا سبق اُسکے دل میں نقش کر دیا گیا۔ چاند بی بی اپنی پیدائش کے بعد ہی ماں کی آغوش سے محروم ہو چکی تھی۔ سلطان نے اُسکی پرورش کی۔ اپنی چھٹی بیوی کی یاد اُسی لڑکی سے تازہ کر لیا کرتا۔ چاند سلطانہ مرحومہ ماں کی زندہ شبیہ تھی۔ سلطان کی اس سے بہت کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ بیٹی ہر وقت باپ ہی کی صحبت میں رہتی۔ اور فی الحقیقت باپ ہی کی گود میں چاند سلطانہ نے حکومت کرنا سیکھا۔ چاند سلطانہ نے صورت بھی

بڑی دلکش پائی تھی۔ اُسکی معصوم اور خوبصورت آنکھیں، اُسکا  
 ہستابی رنگ، اُسکا پیارا قد، بس یہ جی چاہتا تھا کہ دیکھتے ہو۔  
 سیکڑوں شہزادوں نے شادی کے پیغام بھیجے، مگر ملک  
 کی مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر نظام شاہ نے علی عادل شاہ کو  
 چنا۔ اور چاند سلطانہ کی شادی اُسکے ساتھ قرار پاگئی۔ عوام  
 اکا خیال تھا کہ یہ رشتہ دو سلطنتوں کو ایک کرنے کا۔ پھر اتفاقاً  
 ایک جہتی کے ساتھ مغلوں کی روک تھام ہوگی۔

علی عادل شاہ بیوی کو بے حد چاہتا تھا۔ اُسکی کسی خواہش  
 کو رو نہ کرتا تھا۔ سلطنت کے کاروبار پر چاند سلطانہ کی ذہانت  
 فہم اور اُسکی دوراندیشی کا بڑا اثر پڑا۔ اس سے پہلے امراء اپنا  
 سارا وقت جنگ و جدل میں ضائع کرتے۔ اب ان میں صلح اور  
 محبت کا مادہ پیدا ہو گیا۔ جو دولت و ترقی باری اور سیر و شکار  
 میں لڑتی تھی وہ رعایا کی بہبود کے لئے صرف ہونے لگی۔

جو ویران ہو گئی تھیں نمازیوں سے پھر آباد ہو گئیں۔ غریبوں اور  
 یتیموں میں خیرات تقسیم ہونے لگی۔ عدل و انصاف کا یہ عالم  
 تھا کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ لیکن کسی کے دل  
 سے ایک سے نہیں رہتے۔ زمانہ کی گردش کا کوئی اعتبار نہیں  
 سچا پور کی بربادی کے دن بھی آگئے۔ موت کے بے رحم پنجوں نے  
 سچا پور والوں سے اُنکے والی علی عادل شاہ کو چھین لیا۔  
 شہداء میں چاند سلطانہ کا سہاگ لٹ گیا۔ گو وہیں کوئی  
 بچہ بھی نہ تھا جس سے اُسکے دل کو ڈھارس ہوتی۔ اُمراء کی  
 دست درازیوں کا کوئی روکنے والا نہ رہا تو اُنھوں نے بھی خانہ جنگی  
 شروع کر دی۔

چاند سلطانہ نے کچھ عرصہ تک حتی المقدور رنج و غم کو  
 روکا۔ مگر کہاں تک؟ عورت ذات تھی، کچھ بس نہ چلا۔ زمانہ  
 کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرحوم سلطان کے کم سن بھتیجے ایراہیم کو

گو دیکھی لے لیا اور اُسکی طرف سے سارا انتظام کرنے لگی مگر نہوا  
 ناموافق تھی۔ کامیابی مطلق نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں گو لکنت پڑ  
 بیدر۔ اور دوسری قرب جوار کی ریاستوں نے سراٹھایا۔  
 بیجا پور کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھانے کے خیال سے چاند  
 سلطانہ پر چاروں طرف سے دھاوے ہونے لگے۔ رعایا میں امن  
 اور یکجہتی پیدا کرنے کے لئے چاند سلطانہ نے ایک پرجوش تقریر  
 کی اور اہل بیجا پور کی غیرت، حمیت اور وطن پرستی کے جذبات  
 کو کچھ ایسا ابھارا کہ لوگ آپس کی بھڑک کو بالائے طاق رکھ کر دشمن  
 کے مقابلہ پر نکل گئے۔ اُس نے اُن کو نفاق کے بُرے نتیجے سمجھا  
 اور کہا کہ دشمن دروازہ پر کھڑا ہے۔ تم خواب غفلت سے بیدار  
 نہ ہوئے تو بیجا پور دوسری سلطنتوں کے زیرِ نگیں ہو جائے گا۔  
 یہی سہی وہ آزادی جو تھیں ندگی سے زیادہ عزیز ہے دشمنوں  
 کے ہاتھوں میں چلی جائیگی۔ پھر ہاتھ ملنے رہ جاؤ گے۔ اٹھو اور

آزادی کے لئے مرٹو۔“

چاند بی بی کی تقریر رائگاں نہ گئی۔ اُس میں بلکا کا جادو تھا، سب اپنے آپس کے جھگڑے بھول گئے۔ اور چاند بی بی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے، سب نے ایک ہو کر زور لگایا اور دشمن کو نیچا دکھا دیا۔ دُنیا پر ثابت ہو گیا کہ اتفاق سب سے بڑی قوت ہے۔“ تھوڑے ہی دنوں بعد قسمت نے پھر بلٹا کھایا۔ آپس کے جھگڑے پھر چھڑ گئے، ملک میں تبری پھیل گئی۔ اُسی زمانے میں نوجوان ابراہیم نے بھی جو سن شعور کو پہنچ چکا تھا پیٹ سے پائوں نکالے۔ وہ لوگوں کے زہریلے مشوروں کا شکار ہو گیا۔ اور چاند بی بی کے خلاف سر اٹھایا۔ خون کے آنسو روتی ہوئی چاند بی بی نے احمد نگر کی راہ لی۔ احمد نگر اسکی جائے ولادت تھی۔ مگر وہاں بھی چین کا ٹھکانا نہ ملا۔

بقسمتی نے چاند بی بی کا ساتھ احمد نگر میں بھی نہ چھوڑا۔

جس اطمینان اور بے فکری کی تلاش میں وہ احمد نگر گئی تھی وہ  
 وہاں بھی مفقود تھی۔ خانہ جنگی کا دور دورہ وہاں بھی تھا۔  
 حسین شاہ کا جانشین اسکا بیٹا مر قضا ہو اور وہ بھی تلواری  
 کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سلطنت کا شیرازہ کچھنا شروع ہو گیا  
 دوسرا تخت نشین برہان نے ملک کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو  
 سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ مگر وہ بھی جیت نہ جی  
 کی کامیاب حکومت کے بعد موت کے منہ کا نوالہ ہو گیا۔ حسین  
 کے دوسرے لڑکے کی قسمت کا فیصلہ بھی یوں ہی ہوا۔  
 اب اسکا شیر غور بچہ ابراہیم تخت و تاج کا حقدار قرار پایا۔  
 لیکن اسکا بھی وہی حشر ہوا۔ چانڈی بی سے ملک کی  
 ابتری دیکھی نہ گئی جھٹ شاہی خاندان کے ایک نٹ نہال کو  
 تخت نشین کر دیا۔ اور خود سلطنت کے کاروبار کی دیکھ بھال شروع  
 کر دی۔ اس نے اس ہانت اور ستوری سے اچھے نئے معاملات

سُجھا یا کہ لوگ لوہا مان گئے۔ سلطنت کا کام اس خوش سلیبی سے انجام دیا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ملک میں امن و صلح کا ڈنکا بجنے لگا۔ لوگ چین کی نیند سونے لگے۔ ہر طرح کی شورش دب گئی۔ مگر بعض اُمراء تھے جو چاندنی بی سے جلتے تھے۔ اُنکے دل صاف نہ تھے۔ وہی چاندنی بی کے حسن انتظام میں رخنے ڈال رہے تھے، اُنکی تعداد زبردست تھی۔ چاندنی بی کے روکے کبُتے تھے۔ اُنھوں نے غداروں کی مُغل شہنشاہ اکبر کو خفیہ خطوط بھیجے۔ اور احمد نگر پر چڑھائی کرنے کی دعوت دی۔

اکبر تو اس تاک میں بیٹھا ہی تھا کہ موقع ملے اور سلطنت کو دکن کی طرف بڑھائے خط کا پانا تھا کہ حملہ کی تیاری شروع کر دی شہزادہ مُراد پٹھی دل فوج لیکر احمد نگر پر پُٹ پڑا۔ چاندنی بی بھی شجاعت میں کم نہ تھی۔ صورت تو عورت کی

ضرور تھی۔ مگر دل و دماغ میں کسی مرد سے کم نہ تھی۔ مقابلہ میں بڑے  
 بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ایک طرف وہ اگر صلح پسند  
 حکمراں تھی تو دوسری طرف بہادر اور جنگجو سپاہی بھی تھی۔ پہلے  
 تو اُس نے نمک حرام دغا بازوں کا کام تمام کیا۔ پھر حملہ و کنے کی  
 تدبیریں کرنے لگی۔ اُس نے دل شکستہ درباریوں کو مخاطب کر کے  
 کہا: ”آزادی پر فدا ہو جانے والو! اٹھو، آپس کے نفاق کو بالائے  
 طاق رکھ دو۔ ملک کی حفاظت تمہارا فرض ہو۔ تیار ہو جاؤ!۔  
 دشمن تمہیں دھمکیاں دے رہا ہے۔ ایسا نہ ہو ان کے سامنے تم ذلیل  
 و حقیر ثابت ہو۔“ مختصر سی تقریریں نہ جانے کیا اثر تھا کہ سب کے ہاتھ  
 شمشیر کے قبضہ پر جا پڑے۔ سب نے قسم کھائی کہ مرکز بھی دشمن کو  
 پیٹھ نہ دکھائیں گے۔ چاند سلطانہ نے والی بیجا پور سے مدد  
 کی درخواست کی اور کمکٹ انگلی قلعہ کے اندر سامان رسد کافی  
 جمع کر لیا۔ اور پھر شاہنواز و مراد کو پیغام بھیجا۔ ”اگر دوستانہ تعلقات



قائم رکھنا منظور ہے تو تم کو سر پر بٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن  
 اگر لڑائی مقصود ہے تو اس سے ہم لوگ منہ نہ موڑیں گے۔ اگر  
 اور مرنے پر تیار ہوئے ہیں۔ جب تک جسم میں خون کا ایک قطرہ  
 ہے سر نہ چاہئے ہوگا۔ ” مراد ایسی دھکیوں کو کہ خاطر میں لانے والا  
 تھا اُسکو تو شہنشاہ اکبر کی خوشنودی مد نظر تھی، احمد نگر پر قبضہ  
 کرنا اصل مقصد تھا۔ مع اپنے لشکر عظیم کے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔  
 چاندنی بی نے ایسی صورت میں کیا کیا ہوگا؟ عورت  
 تو تھی ہی قلعہ بند کر کے بیٹھ رہی ہوگی؟ مگر نہیں! اُس نے ایسا  
 نہیں کیا۔ اُس نے ہتھیار باندھے۔ خود ناکے ناکے کا معاملہ  
 کیا۔ اور جو لوگ اُنکی محافظت پر تعینات تھے اُن کو مشورے  
 دے کر میدان جنگ میں آئی۔ یہاں دیکھتی کہ گھمسان لڑائی  
 ہو رہی ہے وہیں چاندنی بی آدمیوں کا دل بڑھانے کیلئے  
 آمو جو دھوتی۔ آدمیوں کا دل بڑھانا اور وہ خوش میں آندے

ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے۔ قلعہ کی دیواروں میں ادھر شنگاف ہوا  
 ادھر اسکی مرمت ہوتی۔ احمد نگر کے عرب تیر انداز اپنے فن میں کامل  
 تھے۔ مغلوں کے وراثت کھٹے کرتے۔

شہزادہ مراد اس زعم میں تھا کہ عورت ذات بھلا کیا تھا  
 کریگی۔ مگر چاند بی بی کی بہادری اور سپہمگری نے اُسکے حواس  
 ٹھکانے کر دیے۔ چاند بی بی نے بڑے بڑے سپاہیوں کے کان  
 کاٹ لئے۔ اب چاند بی بی کے سپاہیوں کو بھوک اور پیاس  
 ستانے لگی۔ بہت سے توماے جا چکے تھے، اور مغلوں کو کامیابی  
 کی اُمید نظر آنے لگی تھی۔ دیوار میں بھی سورخ ہو گیا تھا۔ چاند  
 بی بی عین اُس موقع پر پہنچی جب سپاہی دل شکستہ ہو کر میدان  
 چھوڑنے کا قصد کر رہے تھے۔ اُسے خطروں اور دقتوں کا احساس  
 ضرور تھا۔ مگر اُس نے جرأت کر کے سپاہیوں کو لٹکارا۔ "بہادرو!  
 میرے ملکی بھائیو! خوب لکھول کر لڑے۔ شاباش! مگر کیا استفادہ

خوں ریزی اور سفر و شہی کے بعد تم دشمنوں کے سامنے ہتھیار  
ڈال دو گے؟ تقدیر کو پٹا کھاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ زمانہ کانگ  
ایک ایک پل بدلتا رہتا ہے۔ آج سامنے ہم کوشکست کی  
منحوس صورت دکھائی دے رہی ہے۔ کل کامیابی ہماری گود  
میں ہوگی۔ ذرا عادل شاہی اور نظام شاہی زمانوں کو تو یا  
کرو۔ سب کچھ ہاتھ سے نکل گئے مگر آج تک گردن نہیں ٹھکلی۔  
وہ بھی کوئی انسان ہے جس کو اپنے وطن اور ہم وطنوں سے  
محبت نہ ہو۔ آزادی اور ناموس کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو جانا  
بہتر ہے۔ تم میں کون ایسا بزدل اور بے غیرت ہے جو دشمنوں  
کی غلامی قبول کرے گا؟ خیر تمہارا جواب جو کچھ بھی ہو میرا جواب  
سُن لو۔ میں ہوں تو عورت مگر کیا مجال یہ نفل مجھے اپنا غلام  
بنالیں۔ تم سب میرا ساتھ چھوڑ دو۔ میں تنہا مقابلہ کروں گی۔  
یہ کہتے ہوئے چاند بی بی قلیش کریں گھس ٹپری، اور

ہیبت ناک "کالی" کی طرح تلوار ہاتھ میں لیکر سر قلم کرنے لگی۔  
 دشمنوں کا صفایا یوں ہونے لگا جس طرح کسان ہری بھری  
 کھیتی کو کاٹتے ہیں۔ چاند بی بی کی تقریر سے متاثر ہو کر اُسکے  
 سپاہی پل پل پڑے اور ایسا جھم کر پڑے کہ مغلوں کے پتے پانی  
 کر دیے۔

مُراد پہلے سے چاند بی بی کی دلیری کا اندازہ نہ کر سکا  
 تھا۔ اب اُس پر اس عورت کا رعب چھا گیا، اُس نے فیصلہ  
 کر لیا کہ جب تک چاند سلطانہ سپاہیوں کے ساتھ ہو احمد نگر  
 کا فتح کر لینا دشوار ہے۔ احمد نگر محفوظ رہا۔ مُراد نے صلاح  
 مشورہ کر کے چاند بی بی سے صلح کی درخواست کی۔ چاند بی بی  
 مُراد کے سپاہیوں کی کمزوری کو سمجھ رہی تھی۔ اُس نے فوراً  
 صلح منظور کر لی۔

۱۷۔ کالی ایک رکشش ہے جو فتنہ و فساد برپا کرتا رہتا ہے۔

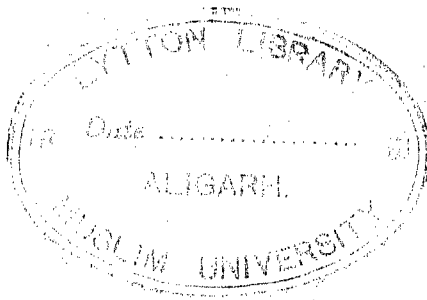
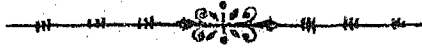
کچھ عرصہ بعد غداروں نے پھر ایک نیا شگوفہ کھلایا۔ پھر  
 اکبر کو خطوط بھیجے جانے لگے۔ اس مرتبہ چند نکاح حرام و بارہیل  
 نے اکبر کو میدان جنگ میں خود آنے کی ترغیب دی۔ وہ  
 آیا۔ اور چاندنی بی کی سرکردگی میں احمد نگر کے مغلوں کا  
 مقابلہ کیا۔ اور خوب کیا۔ ہمت اور مردانگی دیکھ کر چاند  
 بی بی دست بدست لڑ رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب بارہو  
 اور گولیان ختم ہو گئیں تو اُس نے بندو قوں میں چاندی سونے  
 کے زیورات اور سکے بھڑا شروع کئے۔ اکبر غور سے کارزار  
 کا رنگ دیکھتا رہا۔ چاندنی بی کی شجاعت دل میں گھر  
 کر چکی تھی۔ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ لڑائی بند کی جائے۔  
 ایسی بہادر عورت کی دوستی باعث فخر ہے۔ اُس نے فوراً  
 چاند سلطانہ کو سلامی دی۔ اور صلح کی خواہش ظاہر کی۔  
 چاند سلطانہ خود بھی تھک چکی تھی، چاہتی تھی کہ کشت و خون

بازار اب بند ہو۔ اُس سے اپنے آدمیوں کا لڑ لڑ کر مرنا دیکھا  
 نہ جاتا تھا۔ اُس نے اکبر کی درخواست منظور کر لی۔ لیکن یہ  
 اُس کے لئے آخر میں خطرناک زہر ثابت ہوا۔ اُس کے سپاہی موقع  
 اور مصلحت کو نہ سمجھ سکے۔ وہ اس خیال میں تھے کہ فتح ہمارے  
 ہاتھ ہے اور اکبر کی فوج کے قدم بس اب اُکھڑنا ہی چاہتے ہیں  
 کہ لٹنے میں اُن کو ہاتھ روک دینے کا حکم ہوا۔ وہ غصہ سے مریج  
 و تاب کھانے لگے۔ اُن کو طرح طرح کی بدگمانیاں ہونے لگیں  
 چاند سلطانہ کے دشمن تو آگ میں تھے ہی یہ افواہ اڑادی  
 کہ چاند سلطانہ نے خود ہی مغلوں کو احمد نگر میں داخل ہونے  
 کی اجازت دی ہے۔

چاند بی بی جنگ کو بند کر کے اپنی خلوت میں بیٹھی ہوئی  
 تھی کہ یکایک بدول اور بدگمان فوج کے سپاہی اُس میں ٹپس  
 آئے اور شریف اور دلیر چاند بی بی کو جو بھی ابھی میدان جنگ میں

میں دوش بدوش اُن کے ساتھ تھی۔ اور اپنے جوش و استقلال  
سے اُن کا دل بڑھا رہی تھی قتل کر دیا۔

یہ تھا چاند بی بی کا حسرت ناک انجام۔ اُسکے کارنامے  
تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے اور ہر زمانے میں اُس کا نام احترام  
اور تعظیم کے ساتھ لیا جائے گا۔



(۳)

## تارا بابائی

تارا بابائی کا شمار اُن عورتوں میں ہے جنہوں نے اپنے ذاتی نام و نامور اور فلاح و بہبود کے لئے بڑے بڑے کارنامے کئے ہیں۔ اُس نے ٹمک کی کوئی خدمت کی اور نہ قوم کے لئے کچھ گنویا۔ پڑھنے والوں کا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تارا بابائی نے جو کچھ کیا وہ اپنے بیٹے کے لئے کیا، اور اس لئے اُس کا نام ہندوستان کی جانباز عورتوں کی فہرست میں نہ ہونا چاہئے۔ لیکن جس رزمینی اور سوجھ بوجھ کیساتھ اُس نے اپنا کام کیا۔ اور جس دلیرنی استقلال کا ثبوت دیا اُس کو دیکھتے ہوئے تارا بابائی کا شمار ملک کی نامور عورتوں میں نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

تارا بابائی ایک مرہٹہ سردار تھیراؤ کی بیٹی اور سیواچی کے



دوسرے بیٹے راجہ رام کی بیوی تھی۔ علاوہ تارا بانی کے  
 راجہ رام کی کئی اور بیویاں بھی تھیں۔ جہانگی بانی تو مرچکی  
 تھی۔ مگر راجس بانی اور امبکا بانی، تارا بانی کی شادی  
 کے وقت زندہ تھیں۔ چند سال بعد اُس سے ایک لڑکا پیدا  
 ہوا جس کا نام اُسکے مشہور دادا کے نام پر شیواجی رکھا گیا  
 یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مرہٹے مغلوں سے لڑ رہے تھے۔ اس جنگ  
 آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں کو اورنگ زیب کے مقابلہ میں  
 شکست ہوئی۔ راجہ رام دکن کی طرف بھاگا۔ اور جینچی میں  
 پناہ لی۔ جب کچھ اطمینان ہوا تو اُسے اپنی رانی تارا بانی کو  
 بھی وہیں بلوا بھیجا۔ کانکن کے کنارہ دھرے ہوئے تارا بانی  
 مع اپنے ساتھیوں کے پانڈیکچری پہنچی۔ راجس بانی کے  
 بھی ایک بیٹا تھا اُس کا نام شمبھاجی تھا۔ اور وہ ۱۶۹۳ء  
 میں پیدا ہوا تھا۔ امبکا بانی سے بیٹی ہوئی تھی جو کم سنی ہی میں

ماں کی گود خالی کر گئی تھی۔ مغللوں نے چنچھی کو بھی گھیر لیا۔ مگر اُس کے قابض نہ ہو سکے۔ راجہ رام بھاگ کر ہمارا ستر پہنچا اور وہاں مغللوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ مگر روز کی ڈرائی اور روز کے اندیشوں نے اُسکی تندرستی میں گھٹن لگا دیا۔ آخر کار سنہ ۱۷۸۷ء میں دُنیا سے کوچ کر گیا۔

راجہ رام، سیواجی کا چھوٹا بیٹا تھا۔ سا ہو جو دراصل وارث تھا مغللوں کی قید میں تھا۔ راجہ رام محض سکا قائم مقام تھا۔ اب یہ سوال درپیش ہوا۔ اسکے دو بیٹے تھے۔ ایک تو سیواجی جو تارا بانی سے تھا۔ اور دوسرا سہمبھاجی جو امبیکا بانی کے پیٹ سے تھا۔ دونوں پٹالال میں مقیم تھے۔ امبیکا بانی تو شوگر کی بخش کے ساتھ سستی ہو گئی تھی۔ رہ گئی تارا بانی، اُس نے اپنے کام میں دیر نہیں کی۔ درباریوں سے کہا کہ سیواجی کو اپنا بیٹا تسلیم کرو۔ چند نکاح حلال درباریوں کو عذر ہوا۔ اُنھوں نے کہا

کہا "ساہو کی غیر موجودگی میں تم خود اسکی نیابت کر سکتی ہو۔  
 بیٹے کو گتھی پر بٹھانے کا تم کو کیا حق ہے؟" رانی یہ سن کر آگ بگولا  
 ہو گئی۔ ان درباریوں کو تو قید خانہ میں ڈال دیا، اور دوسروں کی  
 مدد سے سیو اچی کی رسم تاج پوشی دھوم دھام سے ادا کی۔ سیو اچی  
 ستائیس برس تخت نشین ہوا۔ اُسی زمانہ میں بھوانی بانی کے ساتھ  
 اسکی شادی رچانی گئی۔ تارا بانی نے بڑی دور اندیشی سے کام  
 لیا اور راجس بانی اور اُسکے بیٹے سمبھاجی کو قید کر دیا۔  
 اب تارا بانی اس قابل تھی کہ مغلوں کا سامنا کر سکے۔ تارا  
 بانی اپنے بہادر باپ کے سائے جنگی ہتھکنڈوں سے واقف تھی۔ مجرا  
 و دیوری، جھاکشی اور چستی و چالاک کی تو اُسکو ترکہ میں ملی تھی۔ ایک  
 خیمہ سے دوسرے خیمہ اور ایک قلعہ سے دوسرے قلعہ تک ہوا  
 باتیں کرتی ہوئی جاتی تھی۔ تھکنڈو کو یا جانتی ہی نہ تھی۔ اسوقت  
 اسکی زندگی ایک معمولی سپاہی کی زندگی تھی۔ دن ہو تو پتے پتے

سُورج کی کوئی پروا نہیں۔ رات ہے تو زمین پر پڑے ہیں کوئی عار نہیں۔ جہاں دیکھو تارابیائی موجود، ہر وقت تازہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف۔ درباریوں اور سپاہیوں پر اسکی بہادری اور مستعدی کی دھاک بیٹھ گئی۔

اورنگ زیب کو کبھی خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ تارابیائی اپنے دُھن کی ایسی پتی نکلے گی۔ عورت ذات اور غلوں سے مقابلہ کیسی بے تک بات تھی؟ آخر کار اُسے بھی داؤں پیچ نکالے۔ اُس نے ساہو کو مجبور کیا کہ وہ مختلف مرہٹہ سرداروں کو خط لکھ کر اُن سے حلف لے کہ وہ غلوں کا ساتھ دیں گے۔ غرض صرف یہ تھی کہ مرہٹہ سرداروں میں پھوٹ کا بیج پڑ جائے۔ ساہو خود مرہٹوں کو راہ پر لگانے کے لئے روانہ ہوا۔ تارابیائی کو بیٹے کی حکومت سنبھالنے میں بے حد رحمت اُٹھانا پڑی۔

شیواجی غبی اور کمزور تھا۔ اب اسکی بیٹی نے بھی اپنے

بیٹے سمجھا جی کی خاطر آج تخت کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ خانہ  
 جنگیاں چٹھڑا ہی چاہتی تھیں کہ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ساہو  
 سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ ادھر تارا بابی کے ہوا خواہوں  
 نے ذامن سمیٹا اور ایک ایک کر کے ساہو کی طرف ہو گئے۔ مگر  
 تارا بابی نے پیشانی پر پل نہ آئے دیا۔ اُس نے اب یہ خبر اڑادی  
 کہ اصلی ساہو تو زندہ ہی نہیں رہا۔ اُسکو تو مرے وعدہ ہوا۔ اپنے  
 آدمیوں سے کہا کہ دودھ اور اُبلتے ہوئے چاول پر قسم کھاؤ اور  
 وعدہ کرو کہ جیتے جی میرے بیٹے کا ساتھ نہ چھوڑ گے۔ اُن میں چند  
 ہی لوگوں نے تارا بابی کے کہنے پر عمل کیا اور قسم کھائی۔ بہتیروں  
 تو یہ کہہ کر اُٹلے یا کہ ساہو کے دُنیا سے چل بٹنے کا کوئی ثبوت نہیں  
 اس بنا پر ساہو بھی منہ نہیں طے کرتا، لوگوں سے دوستی  
 پیدا کرتا، مارا پیٹا چلا آ رہا تھا۔ اسکے ساتھ یوں آدمیوں کی کافی تعداد  
 تھی اور مرہٹہ سردار بھی اُسکا ساتھ دیتے کا حتمی وعدہ کر چکے تھے۔

سا ہو قلعہ پر قلعہ فتح کرتا آخر کار پنہا لا میں داخل ہو گیا۔ تارا  
 بانی وہاں سے رنگنا بھاگی۔ پنہا لا فتح ہو چکا تو سا ہونے  
 رنگنا کی سمت باگ موڑی۔ رنگنا کی قلعہ بندی معمولی نہیں تھی  
 سا ہونا کام رہا۔ زور تو ایڑی چوٹی کا لگایا، مگر قسمت میں فتح تو  
 تھی نہیں۔ قلعہ ہاتھ آتا تو کیونکر مجبور اپنا سامنہ لیکر پلٹ آیا  
 پھر کیا تھا، تارا بانی کی قسمت کا ستارہ ایک مرتبہ پھر چمک اٹھا  
 اُسکی مُردہ اُمیدوں میں جان پڑ گئی، اور یہاں تک لڑ بھا کہ  
 پنہا لا پر دھاوا مارا اور بات کی بات میں قبضہ کر لیا۔ اُس نے  
 قلعہ کے سپاہیوں کو رشوت دے کر اپنا بنا لیا۔ پھر تو اسکے استے  
 میں کوئی کاٹتا نہ رہا۔ ادھر سے اطمینان کر کے کوٹھیا پور کا رخ  
 کیا، اور اُسکو مرہٹہ سلطنت کا پایہ تخت قرار دیا۔ وہاں سے چاروں  
 طرف گماشتے دوڑا دے۔ اُنکا کام لوگوں کو سا ہو کے خلاف  
 بہکانا تھا۔

تارا بابی کا مقصد تو فقط اتنا تھا کہ وہ لوگ جس ساہو کے تھے  
 ہو گئے تھے یا تو خود مختار اور آزاد ہو جائیں، یا مغلوں کے ساتھ ہو  
 رہیں۔ اکثر مرہٹہ سرداروں نے یہی کیا کہ وہ یا تو خود مختار ہو گئے  
 یا انعام و اکرام کے لالچ میں مغل شہنشاہ کے طرفدار ہو گئے۔ اس  
 طرح ایک عورت کی جاں توڑ کوششوں نے ساہو کی ساری  
 امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کہاں دو سال پیشتر تاجر مروج ہوا کہ  
 ساہو کی قسمت کا ستارہ اوج کمال پر چمکتا نظر آ رہا تھا۔ یا اب  
 زوال آیا تو ایسا کہ لے دے کر ایک ستارہ کا خطہ اُس کے قبضہ میں  
 رہ گیا تھا۔ یا پھر اطراف کے چند چھوٹے چھوٹے پہاڑی قلعے جو  
 وفادار افسروں کے ہاتھ میں تھے۔

وہی بات میں تارا بابی کی قسمت پھر لپٹ گئی۔ اس کو قلعہ  
 کی خوبی کہنے یا زمانہ کا انقلاب شکر زائیں جو بہادری میں کھینچا  
 تھا۔ اور دنیا جس کی جواں مردی کا گیت گاتی تھی، اب تک

تارا بانی کا خیر خواہ اور طرفدار تھا، اُس کو اب تک یقین تھا  
 کہ اصلی سا ہونزدہ نہیں ہے جب یہ راز کھل گیا کہ تارا بانی نے  
 سب کو دھوکا دے رکھا ہے تو اُس نے اسکا ساتھ چھوڑ دیا۔ سا  
 کا وزیر اور اُسکا خاص شیر بالاچی و شونا تھ ذات کا بہن تھا  
 وہ بڑا فساد ہی تھا۔ اُس نے سازشوں کا جال پھیلا کر شروع  
 کر دیا۔ وہ خوب جھٹکتا تھا کہ جب تک تارا بانی کو لٹھا پور میں  
 سا ہو کی دال گلنا محال ہے۔ اُس نے راجہ رام کی بیوہ جس  
 بانی کو پیغام بھیجا کہ ”اگر تم تارا بانی اور اُسکے بیٹے کو کسی طرح رک  
 دے دو تو میں سا ہو کی طرف سے تمھاری مدد کا وعدہ کرتا ہوں۔“  
 راجہ بانی نے اس پیام کو اپنی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا۔ فوراً  
 اکرمیت باندھ کر گھڑی ہو گئی۔ ساتھ میں کو لٹھا پور کے اُمر  
 کی مدد سے پنہالا کے محافظوں کو کچھ دے دلا کر اپنی طرف کر لیا۔  
 تارا بانی کی ساری حکومت خاک میں مل گئی۔ اپنی حوصلہ مندی کا



ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا دے سکتی تھی کہ اُس نے تارا بانی  
اور اُسکے بیٹے شیواجی کو قید خانہ میں جھونک دیا، اور اپنے بیٹے  
سمبھاجی کو گدے پر بٹھا دیا۔

راجس بانی اور سمبھاجی کو کچھ زیادہ دن عیش و  
جشن منانا نصیب نہ ہوا۔ سا ہو تو گھات لگائے موقع کا  
منتظر تھا ہی۔ فوراً اپنے آدمیوں کو تعینات کیا۔ وہ یکایک  
سمبھاجی پر ٹوٹ پڑے۔ بیچارہ کو بھاگتے ہی بنی۔ اب احس  
بانی اور تارا بانی دونوں اُنکے بس میں تھیں، اُنھوں نے  
دونوں کو سا ہو کے پاس ستارا بھیج دیا۔ سا ہونے بڑی تعظیم  
کے ساتھ اپنی دونوں بدخواہ ماؤں کا استقبال کیا۔ وہ اُن کو  
پنہ لال میں عزت و آبرو کے ساتھ نظر بند رکھنا چاہتا تھا۔  
تارا بانی کو راجس بانی سے کچھ ایسی کہ تھی کہ اُسکے ساتھ قید خانہ  
میں بھی رہنا گوارا نہ کیا۔ اُس نے سا ہو سے کہا: "میں ستارا

ہی میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ ساہو نے منظر کر لیا۔ اُسکے لئے  
قلعہ میں ایک محل تعمیر کرا دیا۔ جس میں تارا بابی نے ساہو کے  
مرنے تک زندگی بسر کی۔

ساہو لا ولد مرا۔ تارا بابی کے بے ہوش ہونے کے بعد ایک تہہ  
پھر اُبھرے قسمت آزمائی کے لئے تیار ہو گئی۔ ساہو کا لا ولد  
مہربان کچھ اچھا نہ ہوا۔ وہ سمجھاجھی سے مُطلق خوش نہ تھا۔ اگر  
تارا بابی کا لڑکا سیدو اچھی ہوتا تو اُسے ضرور اپنا وارث قرار دیتا  
مگر موت اُسکا بھی کام تمام کر چکی تھی۔ ساہو کی بیوی سگولہ بابی  
ذرا تند مزاج تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ ساہو کسی گود لے اور اُسی  
کو اپنا وارث بنائے۔ اُسے بالاجی و شوناما تھ سے بھی عداوت  
تھی۔ اُسکے خلاف اُس نے ساہو کے کان بھڑا شروع کر دیے۔  
چاہتی تھی کہ برہمن کو ملازمت علیحدہ کر دیا جائے۔ ساہو بھی کبھی  
گود لینا ہی چاہتا تھا کہ تارا بابی کو خبر لگ گئی۔ بڑھاپے نے اُسکے

حوصلوں کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ اُس نے جہاں بسببِ اجہ سے ملاقات  
 کی اجازت طلب کی۔ اور سرہانے آکر بہت کچھ اونچا نیچا سمجھا کر  
 کہا کہ ایک اجنبی کو گودے کر گدی پر بٹھا دینا خلافِ مصلحت ہے  
 ابھی تو ایک ثارِ سلامت ہے۔ گدی اُسے کیوں نہ ملے؟ سا ہو بخیر  
 سمجھا جی کے اور تو کسی حقدار کو جانتا نہ تھا۔ اُس نے حیرت سے پوچھا  
 وہ کون؟ مارا بابائی نے جواب دیا کہ اُسکے بیٹے سیو اجی کی بیوی  
 بھوانی بابائی سے ایک بیٹا ہے۔ جو شوہر کے مرنے کے بعد پیدا  
 ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں اُس نے ایک عجیب قصہ بھی بیان کیا۔ وہ  
 یہ تھا کہ مبادا راجس بابائی، بھوانی بابائی کے بیٹے سے کوئی بدسلوکی  
 کر بیٹھے مارا بابائی نے بچہ کو افیون کھلا دی تھی۔ اُس پر ایسی گہری نیند  
 طاری ہوئی کہ لوگ اُسے مردہ سمجھنے لگے۔ اسکے بعد اُس نے اسکا  
 جنازہ بھی نکالا۔ اور بجائے بچہ کے دو مرغلوں کو دفن کر دیا۔ یہ سب  
 بچہ کو راجس بابائی کے بچہ سے بچانے کے لئے کیا گیا تھا۔ سا ہو کو

تارا بانی نے پورا یقین دلایا کہ وہ بچہ رام راجہ دورا چوتوں کی  
 آنکوش محبت میں پل رہا ہے۔ سا ہوتا رابی کا بڑا احترام  
 کرتا تھا۔ اُس نے اسکو جھوٹا تو نہیں سمجھا۔ مگر اپنی حیرت دور  
 کرنے کی غرض سے پوچھا "اسکا کوئی ثبوت بھی پیش کر سکتی ہو؟"  
 تارا بانی کسی کام کو ادھر ادھر اچھوڑنے والی نہ تھی۔ فوراً راجپوتوں  
 کو لا کر کھڑا کر دیا۔ اُنھوں نے تصدیق کی کہ تارا بانی کا بیان  
 حرف بحرف صحیح ہے۔ پھر تو ساہو کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی  
 اُس نے طے کر لیا کہ رام راجہ ہی راج پاٹ کا مالک ہوگا۔  
 سکور بانی اور ہی خواب یکہ رہی تھی۔ اُسکی نظر  
 ایک ایسے لڑکے پر تھی جو کمزور اور زالا لاق تھا حکومت کی  
 قابلیت اُس میں بالکل نہ تھی۔ سکور بانی کو پوری اُمید تھی  
 کہ اُس لڑکے کی تخت نشینی سے اُسکا اپنا اقتدار بڑھ جائیگا۔  
 حکومت کی باگ ڈور اُسکے ہاتھ میں ہوگی۔ اپنی اُمیدوں کو

اس طرح پامال ہوتے دیکھا تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس  
 جا کر سا ہو سے کہا کہ تھیں سیدھا سا داس سمجھ کر یہ چال چلی گئی  
 ہے۔ سا ہونے اپنے پیشوا بالاجی کو خفیہ ہدایت دے رکھی تھی  
 کہ میرے مرنے کے بعد رام راجہ کے سوا کوئی تخت پر قدم نہ  
 رکھے۔ اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ محل کی نگرانی فوج کے سپرد کی جائے  
 تاکہ سکورانی یا سمبھاجی، رام راجہ کے راستہ میں کسی قسم  
 کی رکاوٹ نہ پیدا کرنے پائیں۔ یہ وصیت کر کے سا ہو ہری  
 ہری، شیو، کرتا سو جگ کو سدھارا۔ ادھر سا ہو کا دم ٹوٹا۔  
 ادھر پیشوائے آدمیوں کو اُس کے جانشین رام راجہ کو لانے  
 کے لئے بھیجا۔ اُسے تو تخت پر بٹھایا، اور سکورانی کو شوہر کی  
 جانے کے لئے مجبور کیا۔ بالاجی و شوہر تھ یہ چاہتا تھا کہ  
 سلطنت کا مالک خود بن جائے، اور رام راجہ اُس کے ہاتھ میں  
 محض کٹھ پتلی بنا ہے۔ اُس نے رام راجہ سے کہا کہ آپ

ابھی بچہ ہیں، چہین سے سونے کے دن ہیں۔ پینسٹھ لاکھ سالانہ  
جدید خراج قبول فرمائیے اور اجازت دے دیجئے کہ میں تارا بانی  
کے ساتھ ہو کر سلطنت کا کاروبار دیکھوں۔ آپ ستارا میں جہاں  
چاہیں آئیں جائیں۔

رام راجہ کو یہ صلاح پسند آئی۔ مگر تارا بانی کب ماننے  
والی تھی۔ اُس نے جیوں ہی سنا جل کر خاک ہو گئی۔ وہ ماڑ گئی  
کہ میرا نام صرف اپنی غرض کے لئے پیشوانے شامل کر لیا ہے  
اپنی جگہ پر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ پوتا تو بڑے نام بادشاہ ہوگا۔  
اصلی حکمران میں ہوگی۔ مگر اب اُسکی اُمیدیں خاک میں مل رہی  
تھیں۔ فوراً بالاجبی کی مکاری کا جواب سوچ نکالا۔ اُس نے یہ  
خواہش ظاہر کی کہ میں سنہاگڈھ جاؤں گی، اور اپنی زندگی کے  
باقی دن اپنے شوہر رام راجہ کی قبر پر گزاروں گی۔ ناجوشی  
کے دو ماہ بعد تارا بانی قلعہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

سنہا گڈھ کا حاکم چمناجی ایک بہادر سپاہی تھا۔ مارا  
 بانی کا داؤں اُس پر چل گیا۔ حاکم نے پیشوا کو نیچا دکھانے اور نوجوان  
 رام راجہ کو اُسکے پنجے سے چھڑانے کا بیڑا اٹھالیا۔ بالاجی پہلے  
 ہی تار گیا تھا کہ مارا بانی کا سنہا گڈھ جانا مصلحت سے خالی  
 نہیں ہے۔ جیوں ہی اس ساز باز کی خبر بانی اُس نے چمناجی  
 اور مارا بانی کو دربار میں طلب کیا، اور دھمکا یا کہ اگر آئے میں ذرا  
 بھی تامل کیا تو سخت سزائیں بھگتنا ہونگی۔ دونوں باغیوں کے  
 ہاتھ کے طولے اڑ گئے۔ مگر اب کہہ ہی کیا سکتے تھے؟۔ ناچار حکم  
 کی تعمیل کرنا پڑی۔ بالاجی بھی بڑا چالاک و فہم تھا۔ اُس نے  
 مارا بانی کی بڑی خاطر مدارت کی۔ نذرانہ پیش کیا۔ اور پھر  
 عزت اور عظیم کے ساتھ ستارا بھیج دیا۔ اس طرح اُس کا مارا بانی  
 کو چمناجی سے جدا کر دیا۔ اور چمناجی کو قید خانہ میں جھنک دیا  
 لوگ سمجھتے ہوئے کہ مارا بانی نے ہار مان لی۔ مگر ایسا نہیں

اپنی کھوئی ہوئی حکومت کے حاصل کرنے کی دھن اُسے اب بھی  
 تھی۔ وہ تدبیریں سوچا کرتی تھی۔ اور ایک لمحہ کے لئے غافل نہ  
 رہتی تھی۔ اُسکا آخری فیصلہ یہ تھا کہ چاہے کچھ ہوا اب اہم راجہ  
 ہی کو قید کر لینا چاہئے۔ پھر اُمرا اور اراکین دربار کی مدد سے پیشوا  
 کو سر کرنا اتنا دشوار نہ ہوگا۔ اُس نے بڑی ہوشیاری اور احتیاط  
 سے اپنی تدبیروں کو عمل میں لانا شروع کیا۔ شیواجی کا مندر  
 ستار کے قلعہ کے اندر تھا۔ اُسکے درشن کے بہانے اندر جانیکی  
 اجازت مانگی۔ افسروں اور سپاہیوں کو رشوتیں دیں۔ ہتھیار اکٹھا  
 کئے، اور رام راجہ کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ آپس آیا اُسکے پاس  
 یہ کہلا بھیجا۔ تمھاری دادی تھیں دیکھنے کے لئے بتیائے، ایک  
 دن کے لئے کھڑے کھڑے اُسکے پاس بھی ہو جاؤ۔ رام راجہ کے  
 فرشتوں کو بھی نہیں خبر تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ خبر ہوتی کیسے؟  
 یہی دادی تھی جس نے اُسے تخت و تاج دلوا یا تھا۔ رام راجہ قلعہ میں



داخل ہوا۔ وادی نے محبت بھرے لہجہ میں داخل ہوا۔ وادی نے محبت بھرے لہجہ میں خوش آمدید کہا۔ ادھر جاں بچھائے جا رہے تھے۔ ادھر نوجوان راجہ شراف کباب میں لگ گیا۔ کھاپی کرفارغ ہوا تو وادی سے رخصت ہو کر گھوڑے پر سوار ہوا قلعہ کے پھاٹک پر پہنچا تو دیکھا کہ در بند ہیں۔ دیکھتے دیکھتے تارابی کے سواروں نے اُسکو گھیر لیا۔ اور اُسکو قید میں لے لیا۔ سواروں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ اب راجہ کا شور و غل سب سے سو دھڑکا۔

سپاہیوں نے اس سے ہتھیار لے لئے اور تارابیک قید خانہ ڈال دیا جہاں سے پھر وہ زندہ نہ نکلا۔ تارابی نے اپنے پوتے کو جیتے جی اسی کال کوٹھری میں رکھا۔ پیشوا کی قوت اس عرصہ میں جڑ پکڑتی گئی۔ اُسکا اقتدار یہاں تک بڑھا کہ کسی نے اس طرف توجہ نہ کی کہ بدقسمت ام راجہ قید خانہ میں ایسی بے کسی و بے بسی کی موت مر رہا ہے۔

(۴)

## پنا

آج سے تقریباً ساڑھے تین سو برس پہلے چتوڑ  
 میں ایک راجہ تھا۔ جو رانا سنگھ ام سنگھ کا پوتا تھا۔ او  
 بکرماجیت کے نام سے مشہور تھا۔ رعایا اُس سے راضی  
 نہ تھی۔ وہ نہایت بد ذات اور بد مزاج تھا۔ دربار کے  
 ذمی حیثیت اور باوقار امراء کی اُس کی نظروں میں کوئی  
 وقعت نہ تھی۔ اور اُمراء بھی وہ جو بڑے بڑے بادشاہوں  
 کی نظر میں معزز و ممتاز تھے۔ بکرماجیت کو اپنا سارا تو  
 سپاہیوں اور پہلوانوں کی صحبت میں ضایع کرنے کی  
 لت تھی۔ سلطنت کے کاروبار سے اُس کو کوئی سروکار نہ تھا  
 کھیل کود کا شید تھا۔ اور کسی بات سے مطلب نہ غرض

بہادر شاہ گجرات کا فرماں روا تھا بیٹھے بٹھائے چتور  
 پر آدھمکا اور چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا۔ وہ تو کو  
 خوش قسمتی سے سوتیلی ماں رانی کرنا و تھی اُس کی پشت  
 پناہ بن گئی۔ اُس نے مغل شہنشاہ ہمایوں کی خدمت  
 میں درخواست بھیجی کہ ”آئیے اور ایک دیکھیا کی درسی  
 فرمائیے۔ ملک کو دشمنوں کے پنجہ سے نجات دلوائیے۔  
 ہمایوں بڑا رحم دل تھا۔ کسی کو مصیبت میں دیکھتا تو  
 دل بھرتا۔ راجپوت شریف زادی کی درخواست نے  
 اُس کے دل پر بڑا اثر کیا۔ وہ لشکر عظیم کے ساتھ بہادر  
 شاہ کی سرکوبی کے لئے آموجود ہوا۔ اور اس کو محاصرہ  
 اٹھائے پر مجبور کیا۔ رانا پیراجیت اب چین سے راج  
 کرنے لگا۔ مگر اپنی مصیبتوں اور بد بختیوں سے کوئی سبق  
 نہ لیا۔ سلطنت کی طرف سے وہی بے پروائی۔ امر کے ساتھ

دہی بدسلوکی۔ ایک مرتبہ تو غضب ہی ڈھا دیا۔ کرم چند  
 اجسیر کا ایک بہادر سپاہی تھا۔ دربار میں اُس سے کوئی  
 غلطی ہو گئی مگر راجپوت اُسے مار ہی تو بیٹھا۔ پھر کیا تھا؟  
 راجپوتوں کا خون کھول گیا۔ سب بگڑ گھڑے ہوئے اور  
 ایک دل اور ایک رے ہو کر اُس سے راج پاٹ چھین  
 لیا۔ اب پرتھوی راج کے لڑکے بن بیر کے سر پر تاج پہنکا  
 گیا۔ اور پٹنمست مکر راجپوت کو عبرت حاصل کرنے لے  
 لئے قید خانہ میں ڈال دیا۔

مکر راجپوت کا حقیقی جانشین رانی کرناو تھی کا بیٹا  
 اُسے سنگھ تھا۔ جو ابھی بہت کم سن تھا۔ آپس کی پھوٹ  
 چٹور کو غارت کر رہی تھی۔ ساری ریاست تنکا بوٹی ہو کر  
 رہ گئی تھی۔ درباریوں کو اندیشہ تھا کہ ایسی صورت میں  
 ایک بچہ کو تخت پر بٹھانا نہ جانے اور کیا کیا تباہیاں لائیگا

اسی مصلحت سے بن سیر کو سلطنت کا تخت قیاج سوئپ  
 دیا گیا۔ رانی کرناو تھی مرہی تھی وہ اپنے گود کے بچہ کو پیتا  
 دانی کے سپرد کر کے دُنیا سے چل بسی۔ اور یہ اُمید دُنیا سے  
 اپنے ساتھ لیتی گئی کہ اگر جی مر کے میرا نو نہال بچا تو ممکن ہے  
 ایک دن چپوڑ کا تاج اُسکی پیشانی پر چکے۔

پیتا تھی تو دایہ مگر وفا کی پتلی تھی۔ پیتا کے معنے  
 ”ہیرا“ کے ہیں۔ وہ واقعی اس قابل تھی کہ اس نام سے  
 پکاری جائے۔ اُس نے دُنیا سے رخصت ہوتی، انی سے  
 وعدہ کیا تھا کہ ”نخے شانہ رے کو اپنی اور اپنے دُلا روں کی  
 جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔ ہر طرح کی مصیبت جھیل  
 لوں گی مگر امانت میں خیانت نہ ہونے دوں گی۔ اُدے سنگھ  
 پر کسی قسم کی آخ نہ آنے پائے گی۔“

پیتا کے بھی ایک بچہ تھا، جو اُدے سنگھ کا ہم سن تھا۔

پیتا دونوں شیرخواروں کی پرورش ساتھ ساتھ کرتی تھی  
 اُسے سنگھ جیوں جیوں پروان چڑھتا گیا طاقت اور  
 خوبصورتی بھی بڑھتی گئی۔ دایہ اکثر پانے زمانہ کے بہادر  
 کی کہانیاں اُس کو سناتی اور اُن کی ہمت دلیری کے گیت  
 گا گا کر اُس کے جوش کو ابھارتی۔ اُسے سنگھ بزرگوں کے  
 کارنامے سن کر بہت خوش ہوتا۔ رامائن اور مہا بھارت  
 کی کہانیاں بڑے شوق سے سنتا تھا۔ ایک دن جبکہ پیتا  
 بچوں کو کھلا رہی تھی ایک نوکر اُس کے پاس ڈوڑتا ہوا  
 آیا۔ پریشانی اُس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ اُس نے  
 آتے ہی کہا ”پیتا! بڑا غضب ہو گیا۔ بکراجیت سنگھ  
 قتل کر دیا گیا۔“ پیتا کچھ دیر تک سکنتہ میں رہی۔ وہ جانتی تھی  
 کہ بن پیر دل کا کھوٹا ہے۔ وہ اصلی جانشین کی زندگی میں  
 اپنے کو محفوظ نہیں سمجھے گا۔ ڈری کہ بکراجیت کے بعد

اُسے سنگھ کا کام تمام کرے گا۔ اور ہر مکن کا سٹے کو  
 اپنی راہ سے دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے پل  
 بھر میں ایک تدبیر سوچ لی۔ مگر اُس پر عمل کرنا بڑی جرات  
 کا کام تھا۔ اُس نے اپنے بچہ کو شہزادہ اُسے سنگھ کا لباس  
 پہنایا اور شہزادہ کے بستر پر لٹا کر کہا ”بیٹا سو رہو آج  
 تم شہزادہ کی جگہ کام آؤ گے۔ بھولے بھالے نادان بچہ  
 کو کھپکھپکاتے ہوئے دیکھ کر سنا دیا۔ اُسے سنگھ سے کہا تم کو  
 ایک عجیب ماشہ دکھانے چلیں گے۔ پھر اُسے مکان  
 کے ایک تاریک حصہ میں لے گئی۔ اور پھل کی ایک  
 بڑی سی ٹوکری میں اُسے بٹھا کر کہا کہ خبردار شور نہ مچانا۔  
 اس کے بعد اُس کو تپیل سے ڈھانک دیا اور ایک ملازم  
 سے کہا ”اس کو قلعہ کے باہر چلو۔ میں بھی وہیں سے  
 نکلتا ہوں۔“

پتا اپنے محل میں آئی جہاں اُس کے جگر کا ٹکڑا شنراؤ  
 کے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ چند ہی لمحے گزے تھے کہ دروازہ  
 کھلنے کی آواز کانوں میں آئی، اور پل بھریں بن سیراٹھ  
 میں تنگی تلوار لے داخل ہوا۔ پتا اُسے دُکے کا پنے لگی۔  
 بن بیر نے آتے ہی پوچھا۔ ”پتا! جلد بتاؤ دے سنگھ  
 کہاں ہے؟“ پتا خوب اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنے  
 حواس میں نہ تھی۔ غم اور ہراس نے اُس کا کلا گھونٹ دیا۔  
 بول تو نہ سکی۔ اشارہ سے بتلادیا کہ ”وہ سو رہا ہے“ بے رحم  
 اور ظالم بن سیراٹھ کے قریب آیا۔ تھوڑی دیر تک تو  
 اس بات کا اطمینان کرتا رہا کہ سونے والا اُسے سنگھ ہی ہے،  
 زرق برق لباس ہیرے اور جواہرات سے مُصنَع ٹوپی  
 اور لیشی بستر نے اُس کے سائے شبہ دور کر دئے  
 اُس نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا خنجر بگناہ بچہ کے



سینہ کے پار کر دیا۔ اور خوش خوش اپنے محل کو چلا آیا کہ  
اب تخت و تاج کے لئے جھگڑا کرنے والا کوئی نہیں رہا  
اپنے خیال میں وہ سائے رقیبوں کا خاتمہ کر چکا تھا۔  
جیوں ہی بن بیر کے سے نکلا۔ پنا لیک کر لینا کے  
قریب آئی اور اپنے بچہ کو چھاتی سے لگا لیا۔ جو کچھ پیش آیا سے  
پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اُس نے اپنا وعدہ خوب وفا کیا  
مگر ماں کی مامتا، کہاں تک ضبط کرتی؟ محبت نے جوش مارا  
آنسو اُمڈ آئے اور وہ بھوٹ بھوٹ کر روتے لگی۔ روتے اور  
چلانے کا شور بلند ہو کر محل کی اماؤں کے کانوں تک پہنچا  
دوڑ کر سب پٹنا کے گرد جمع ہو گئیں۔ سب نے پٹنا کے غم میں  
شرکت کی اور بڑی دیر تک بے گناہ بچہ کی لاش پر قائم کرتی  
رہیں۔ صرف پٹنا ہی کو علم تھا کہ شہزادہ اُسے سنگھ ظالم  
بن بیر کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ ہے۔ لوگ سوچ سوچ کر

رو رہے تھے کہ افسوس سنگ ام سنگھ کی نسل کا خاتمہ ہو گیا  
اُسے سنگھ کے قتل نے اُسکے خاندان کو ہمیشہ کے لئے  
نیت و نابود کر دیا۔ مقتول بچہ کا جسم شان و شوکت کے ساتھ  
آگ کی نذر کیا گیا۔ جب بچہ کی راکھ پر پتا خوب دل کھول کر  
آنسو بہا چکی تو اُٹھی اور جلد جلد قدم بڑھاتی ہوئی وفادار  
ملازم کے پاس پہنچی اور شہزادہ اُسے سنگھ کی دیکھ بھال  
میں لگ گئی۔

باوفا غلام چتور کے پیچھے چند میل کے فاصلہ پر ایک دریا  
کے کنارے کھڑا تھا اور بے چینی کے ساتھ پتا کی راہ دیکھ رہا  
تھا۔ خوش قسمتی سے بچہ بھی اُس دن خوب سویا اور کوئی اُسکو  
دیکھ نہ سکا۔ اُنھوں نے دیولا کی راہ لی۔ سنگھ راؤ وہاں کا  
راجہ تھا۔ اُنھوں نے اُس سے درخواست کی کہ اُسے سنگھ  
کو اپنی پناہ میں لے لے۔ اُنھوں نے ہنس کر سمجھا یا کہ سنگھ ام سنگھ

کے خاندان کا یہی ایک نام لیوا رہ گیا ہے۔ کسی طرح اس کی پرورش ہو جاتی تو اچھا تھا۔ مگر راجہ نے صاف انکار کر دیا۔ بات یہ تھی کہ وہ ڈرتا تھا کہ بن بیر کو معلوم ہوگا تو اچھی طرح خبر لے گا۔ پتہ تاہمت ہارنے والی نہ تھی۔ سیدھے ڈونگر پور پہنچی۔ جب راجہ راول اسکرین کو پتہ کی کارگزاریوں کا علم ہوا تو اُس نے کہا "میں اس کو اپنی پناہ میں ضرور لے لیتا۔ مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں اڑھل گیا تو میری اور شہزادہ دونوں کی جان پر آجئے گی۔" پتہ کی درخواست اس طرح یہاں بھی رد ہو گئی۔

ہر حالہ صاف جواب مل رہا تھا۔ پتہ مایوس ہو چلی تھی۔ مگر وہ مستقل مزاج عورت تھی۔ وہ ایسی کم ظرف اور کمزور دل والی عورت نہ تھی جیسا کہ راول اور راول تھے۔ وہ عورت ذات تو تھی۔ مگر جوتربانی اُس نے کی تھی وہ اُس کی جرات

اور بلند جو صنگی کا کافی ثبوت تھی۔ وفاداری اور استقلال کو اپنی اور اپنے بچہ کی جان سے کہیں زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ اُس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ارادل پہاڑ کی پیچ در پیچ وادیوں کو طے کرتی ہوئی میدان کے جنگلی باشندوں یعنی بھیلوں کی مدد سے وہ کوئل میر پہنچی اور فوراً وہاں کے حاکم کو پیغام بھیجا کہ میں آپ کے ملنا چاہتی ہوں۔ حاکم کا نام آسا ساہ تھا۔ وہ چینی تاجروں کے قبیلہ سے تھا اور بڑے خلیق اور خدا ترس تھا۔ جب پتا اُس کے سامنے آئی تو اُس نے شہزادے کو اُس کی گود میں ڈال دیا اور کہا ”اپنے بادشاہ کی جان کی حفاظت کیجئے۔“ اور پھر سارا ماجرا حرف بحرف کہہ سنایا۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آنے والی تھی۔ کیونکہ آسا ساہ نے جب ساری باتیں سنیں تو جو اس باختہ ہو گیا۔ قریب تھا کہ اپنی معذوری بیان کر کے اس بلا کو اپنے سر سے اُلٹا دے۔

کہ اُس کی ماں نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اُس نے کہا ”بیٹا! وفاداری اور صداقت میں خطروں و مشکلات کا ڈر کیسا؟ یہ شاہزادہ سنگ رام سنگھ کی یادگار ہے اور یہی تمھارا اصلی بادشاہ ہے۔ خدا چاہے گا تو انجام اچھا ہی ہوگا۔“

آسا ساہ اپنی بُزدلی اور بے حیلتی پر بہت نادم ہوا۔ بہادر ماں کے جوش بھرے الفاظ نے اُس کا دل بڑھا دیا۔ اُس نے شاہزادہ کو اپنی پناہ میں رکھنے کا وعدہ کر لیا۔ او لوگوں کی بدگمانی کو دور کرنے کی غرض سے مشہور کر دیا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔

پتا اپنے فرض سے سبک دوش ہو چکی تھی۔ اُس نے اب کوئل میرے رخصت ہونے کا قصد کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہاں ٹھہرنا لوگوں کے دلوں میں شک پیدا

کر دے گا۔ وہ وہاں سے چل دی۔ شاہزادہ جوں جوں ان  
 ہوتا گیا اُسکی صورت سے شاہانہ جلال ٹپکنے لگا۔ آخر کار راز فاش  
 ہو گیا اور دور و نزدیک یہ افواہ پھیل گئی کہ کوئل میرے عالم  
 کا بھتیجا دراصل اُسے شکھ ہے۔ چتوڑ والوں کو جب خبر ہوئی تو  
 جان میں جان پر گئی۔ درباری اور امراء بن بیر کی حکومت سہ  
 یوں ہی تنگ آ گئے تھے۔ وہ تو خدا سے چاہتے تھے کہ اُن کے  
 سر سے یہ بلا ٹپے۔ لوگ اس خوشخبری کی تصدیق کیلئے چتوڑ  
 سے کوئل میرے پونچے۔ اور اپنے شاہزادے کو پہچان لیا۔ پتہ  
 بھی اپنے واقعات اُن لوگوں کو سنائے۔ وہ اپنی قربانی اُو  
 جاں فشانی کا پھل اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ  
 تھی۔ لوگ اُسے شکھ کو چتوڑ لائے اور بڑی دھوم دھام سے  
 اُسکی تابوشتی ہوئی۔

## (۵) سینہ گستا

بارہویں صدی میں ایک چھتری راجہ جس کا نام  
 انگ پال تھا دہلی میں راج کرتا تھا۔ وہ سارے ہندوستان  
 کا شنشاہ تھا۔ خدا نے اُسے کوئی اولاد نہ دینی تھی  
 محض دو بیٹیاں تھیں جو دو بہادر راجپوت سرداریوں کو  
 منسوب تھیں۔ اُن میں ایک تو راتھور نسل سے تھا اور فوج  
 کا مالک تھا۔ دوسرا چوہان تھا اور اجمیر کا والی تھا۔  
 انگ پال کے جب کوئی بیٹا تھا ہی نہیں تو پھر تخت تاج  
 کا وارث کون ہوتا؟ اِس کی مرضی پر مختصر تھا جس کو  
 راج پات سوئپ دے۔ اُسکی دونوں بیٹیوں سے دو بیٹے  
 تھے۔ جے چند را اور پرثوی راج۔ جے چند را پہلی رُکی

سے تھا اور پرتھوی راج سے عمر میں چند سال بڑا بھی تھا۔  
 اُسے پوری اُمید تھی کہ تاج شاہی ایک روز میری پیشانی  
 چمکتا ہوگا۔ لیکن قسمت کسی کی لونڈی نہیں۔ انگ پال کی  
 وصیت سے دہلی کے تخت و تاج کا مالک پرتھوی راج  
 ہوا اور جے چندر کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ پرتھوی  
 راج کا انتخاب موزوں بھی تھا۔ اُس میں شہریاری کی ساری  
 صفتیں موجود تھیں۔ اُسکی شریف النفسی، جرات، دلیری  
 اور اچھے اطوار نے شہنشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ غرض کہ  
 جب انگ پال عالم جاودانی کو سدھارا تو اُسکی جگہ  
 پرتھوی راج جلوہ افروز ہوا۔

جے چندر کو جب پرتھوی راج کے تخت نشین ہونے  
 کی خبر ہوئی تو وہ حسد کی آگ میں جل مرا۔ اُس کے غیظ و  
 غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُسے کبھی یہ گمان بھی نہ ہوا



تھا کہ میں اس بُری طرح نظر انداز کر دیا جاؤں گا۔ بلکہ اس کا ظ  
سے کہ دونوں بھائیوں میں وہی بڑا تھا، اُسے یقین تھا کہ  
تخت شاہی میرے قدموں تلے ہوگا اور صد ہا باج گزار  
سرداروں کی گردنیں میرے سامنے خم ہوں گی۔ اس قصہ  
نے اُس کے خیالی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور اُس کے  
ارمانوں کے قلعہ کو پل مارتے زمین پر گرادیا۔ وہ غصہ سے  
بھن اُٹھا اور پرتھوی راج کو اپنے حقوق کا غاصب سمجھنے  
لگا۔ اُس نے پرتھوی راج سے انتقام لینے کی ٹھان لی  
محض موقع اور وقت کا انتظار تھا۔

دو ہندو سرداروں کی باہمی رقابت نے ہندوستان  
کو خاک میں ملا دیا۔ اُسی زمانہ میں ملک غور میں جہ  
کے شمال اور مغرب میں واقع ہے ایک باہمت اور باج  
شخص جس کا نام شہاب الدین محمد غوری تھا برسرِ حکومت

تھا۔ اپنے پیشرو محمود غزنوی کی طرح اُس کے دل میں بھی یہ  
 متنا تھی کہ ہندوستان کو کوٹنا چاہئے۔ اور ممکن ہو تو ملک پہ  
 بھی قبضہ کرنا چاہئے۔ اب تک تو راجپوتوں کی دیرنی نے  
 اُس کے حوصلہ کو پورا نہ ہونے دیا تھا۔ اُسے ”راٹھور“ اور ”چولان“  
 کی باہمی عداوت کی خبر ہو گئی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا؟ حالاً  
 اُس کے ہر طرح موافق تھے۔ اُس نے اتفاقاً ایک لشکر عظیم  
 تیار کر لیا۔ اور دریائے سندھ کو پار کر کے تھانیسر کے میدان  
 میں آدھمکا۔

غوری کے حملہ نے سارے ہندوستان کو بیدار کر دیا۔  
 تمام راجپوت بہادر اپنی اپنی مددگار فوجوں کو لے کر پتھوی  
 راج کے چھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اُن کو خیال پیدا ہو گیا  
 تھا کہ ہمارا دھرم خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اور اس خیال کے  
 پیدا ہوتے ہی انہوں نے دھرم کی حمایت پر کمر باندھ لی۔

پر تھوڑی راج کم سن تھا مگر اُس کی ہمت اور لیاقت کا  
چاروں طرف ڈنک بج رہا تھا۔ وہی تمام فوجوں کا سردار  
بنایا گیا۔ اُس کے ماتحت تمام فوجیں غوری کے حملہ کو روکنے  
کے لئے تھانیسر کی طرف روانہ ہوئیں۔ ایک اکیلا بچہ چند  
تھا جو اُس مہم میں شریک نہ ہوا۔ وہ پر تھوڑی راج سے اتنا  
جلتا تھا کہ اُس نے اپنے ساندان کا ناموس بچانے کیلئے  
پر تھوڑی راج کا ساتھ نہیں دیا۔

تھانیسر کی جنگ جو راجپوتوں اور غوری کے  
ساتھیوں میں ہوئی صرف بارہ گھنٹہ تک جاری رہی۔  
ہر طرف ہمدردی اور جواں مردی کے جوہر دکھلائے جا رہے  
تھے۔ اس میں طرفین کی فوجوں نے نقصان عظیم برداشت  
کیا۔ نہ تو پٹھان ہی ہارنے نظر آتے تھے اور نہ راجپوت  
دیر تک مقابلہ برابر کارا۔ پٹھان جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔

غوری نے ٹھان لیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ہندوستان پر قبضہ ضرور ہوگا۔ راجپوت بھی اپنے ملک اور دھرم کی حمایت میں کچھ کم دلیری سے کام نہیں لے رہے تھے۔ آخر کار جب آفتاب غروب ہو گیا اور تاریکی چھانے لگی تو اس جنگ کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ فتح کا سہارا راجپوتوں کے سر رہا۔ غوری اُس کی فوج کو پسا ہوا پاڑا۔

فتح کی خبر سن کر سارے ہندوستان میں غوثی کے قعرے بلند ہونے لگے۔ مگر جے چند رملول تھا۔ وہ اس وجہ سے نہیں کہ ہندوؤں کو فتح نصیب ہوئی، بلکہ اس وجہ سے کہ فتح پر غوثی لاج کے ہاتھوں ہوئی۔ پر غوثی لاج کی بہادری کی تعریف سنا تو اُس کے زخمی دل کو ٹھیس سی لگ گئی۔ اور بھانٹوں کا اُس کی مدح میں گیت گانا تو زخم پر نمک چھڑک رہا تھا۔ اُس کی اپنی لڑکی سنجوگتا کا اور دل کے

ساتھ جشن منانا اور پیغام فتح سنانے والے کو موتی کا ہار  
نذر کرنا کھولتے تیل پر پانی کا کام کر گیا۔ غرض کہ اُس کے غصہ  
کی آگ ہر طرح بھڑکتی ہی گئی۔

قنوج کے راجہ جے چندر کے صرف ایک بیٹی تھی  
نام اُس کا سنجوگتا تھا۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک  
ہندوستانی عورت میں ہونا چاہئے۔ چاند جو دربار کا شاعر  
تھا سنجوگتا کے حسن کے گیت گایا کرتا تھا۔ جب تک نیا قائم  
ہے اُس کے حسن و جمال کا چرچا ہوتا رہے گا۔ پرتھوی راج  
کی شرافت اور بہادری کا سنجوگتا کے دل پر کافی اثر ہو چکا  
تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا یہ وہ خوبیاں تھیں جو دل میں گھر کے  
بغیر نہیں رہ سکتیں۔ تھا نیسمر کہ میدان میں جس دن سے  
پرتھوی راج کو کامیابی نصیب ہوئی اُسی دن سے وہ  
سنجوگتا کے دل میں بس گیا۔ دن ہو یا رات سنجوگتا کے

دل میں پرتھوی راج کی یاد رہتی تھی۔ اُسکی تصویر ہر وقت  
 نظر کے سامنے رہتی تھی۔ اُسکی جانبازی اور دلیری کے  
 قصوں کے سوا کسی بات میں جی نہیں لگتا تھا۔ جے چند  
 نے سنجوگتا کو اس خیال سے باز رکھنے کی کیا کیا کوششیں  
 نہیں کیں۔ اُس نے ہر چند چاہا کہ لڑکی پرتھوی راج کی  
 محبت کو دل سے دور کر دے مگر ہر کوشش بیکار اور ہر  
 نصیحت اُگلاں ثابت ہوئی۔ اب وہ شادی کے قابل  
 تھی۔ جے چند کو مناسب برکی تلاش ہوئی۔ راجپوتوں  
 کے دستور کے مطابق اُس نے سوئمہر کا اعلان کیا۔ یہ  
 ایک رسم تھی جس میں ہندوستان کے تمام راجہ اکٹھا ہوتے  
 اور لڑکی ایک ہارے کرتام راجاؤں کے پاس سے ہوتی  
 ہوئی گزرتی تھی۔ جو راجہ اُسکو پسند ہوتا وہی اُس ہار کا  
 اہل ہوتا۔ لڑکی گلے میں ہار ڈال دیتی۔ اس طرح لڑکی اپنا

شوہر خود منتخب کر لیتی۔ ایک پر تھوڑی راج ہی ایسا راج  
 تھا جو سنجو گتا کے سوئمبر میں نہیں بلا یا گیا۔ اُسکی ذلت اور  
 توہین میں جے چند نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ پر تھوڑی  
 راج کی ایک مورت جو دیکھنے میں نہایت بد نما تھی صدر  
 دروازہ پر بجائے دربان کے نصب کرادی۔ یہ ایک ایسی توہین  
 تھی جو کسی طرح پر تھوڑی راج جیسے سورما کے شایان تھی  
 پر تھوڑی راج کی ذلت اور توہین سے سنجو گتا کے دل  
 پر سخت چوٹ لگی۔ اُس کو بڑا صدمہ ہوا۔ سوئمبر بغیر پر تھوڑی  
 راج کے اُسکے لئے بیکار تھا۔ وہ اپنی جان، اپنا دل بہادر  
 پر تھوڑی راج کی نذر کر چکی تھی۔ جے چند سنجو گتا کے دل  
 کی اصلی حالت سے بخیر تھا۔ اور بڑی کی محبت کو کڑھکی کے  
 اُبال سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ تو اس خیال میں کہ ادھر  
 سنجو گتا نے سوئمبر میں کسی شہزادے کو پسند کیا اور پر تھوڑی راج

کی محبت دل سے رخصت ہوئی۔

سو بھر کا دن نزدیک ہوتا جا رہا تھا، شہزادوں اور  
امیروں کی آمد قنوج میں شروع ہو گئی۔ اُن کو مختلف محلوں  
میں ٹھہرایا گیا۔ مگر سچو گتا کی کیا حالت تھی؟ اُس کا دل  
دھڑک رہا تھا۔ ”کیا ایک اجپوت کی لڑکی اپنے باپ کی  
خواہش پر اُس شخص کی محبت کو قربان کر دینے کے لئے تیار  
ہوگی جسے وہ اپنا دل کب کی سوئپ چکی ہو؟“ نہیں! او  
کبھی نہیں! وہ اپنے دل میں کہا کرتی ”میری محبت خواب  
خیال نہیں ثابت ہوگی۔ یہ کڑھی کا اُبال ہو کر نہ رہے گی۔  
میری محبت سچی محبت ہے جو میرے اوپر پرقومی راج کے  
درمیان ایک مضبوط زنجیر ہے۔ اپنا ستر تاج کسی اور کو  
منتخب کرنا درکنار اس کا خیال بھی دل میں لانا گناہ اور  
بدترین گناہ ہوگا۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ اپنی جان سے ہاتھ



دھو بیٹھوں گی۔ مگر شادی کروں گی تو پر تھوئی راج کے  
ساتھ اور کسی کے ساتھ نہیں۔ آخری تجویز اُس نے یہ سوچی  
کہ ایک قاصد چوہان کے سردار کے پاس اس پیغام کے ساتھ  
بھیجے کہ محبت کی حفاظت منظور ہے تو پر تھوئی راج وقت  
پر مدد کے لئے آجائے اور سنجو گتا کو وہاں سے لے جائے۔  
انہار محبت کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ طریقہ  
تھا جس پر شہزادی رُکنی نے اپنے مالک کرشن سے انہار  
محبت کرنے کے وقت عمل کیا تھا۔

اس تجویز کے چند ہی منٹ بعد اُس نے ایک مُعتبر  
قاصد کو بلایا اور جو اُس نے لکھ رکھا تھا اُسکو حوالہ کر کے  
تاکید کی کہ جلد جاؤ۔ پر تھوئی راج کو یہ خط دوا اور جواب لاؤ  
قاصد صبار قرار گھوڑے پر سوار ہوا اسے باتیں کرتا ہوا پر تھوئی  
راج کے پاس پہونچا اور ملاقات چاہی۔ پر تھوئی نے اُسکو

اندرا بلالیا۔ قاصد نے امانت سپرد کی۔ پرتھوی راج نے  
خط کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھا۔ ہر دفعہ آنسو اسکی آنکھوں میں  
چھلکنے لگتے جب سے خیال آتا کہ سچو گتا اسکی محبت میں کس قدر  
بے قرار ہے تو اسکا دل بھرتا جب وہ سوچے لگتا کہ شہزادی  
نے اپنی قسمت کا بیڑا بھینسا کیا ہے، اور اگر اُس نے  
پہنچنے میں دیر کی تو جان پڑھیں جائیگی، تو اُس کا جی سن سے  
ہو جاتا۔ پرتھوی راج نے جواب میں اتنا لکھ کر ہر کاسے کے حوالے  
کیا کہ ”دل شکستہ نہ ہو۔ یقین رکھو کہ پرتھوی راج تم سے غافل  
نہیں ہے اور نہ وقت پر تم اُسکو غافل پاؤ گی۔“

پیغام لانے والے کو تو اُس نے رخصت کر دیا۔ خود  
سب سے تیز گھوڑے پر سوار ہوا اور چوٹی کے سپاہیوں کو ساتھ  
لے کر قنوج کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھیک اُس وقت جبکہ  
آفتاب کی گلابی کرنیں آسمان کے مغربی اُفق پر اپنا رنگ

یہی تھیں بہادر راجپوت سوار قنوج میں داخل ہوئے۔  
 اُن کو سوداگر کا بھیس اختیار کرنا پڑا تب شہر کے اندر گزر  
 ہوا۔ شہر میں داخل ہو کر سوئمہر محل کے قریب بیسے ڈال سکے۔  
 آخر وہ صبح بھی آئی جس دن مہمان راجاؤں کی قسمیوں  
 کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ لوگ سوئمہر کی تقریب میں جوق جوق  
 شہر کی گلیوں میں جمع ہونے لگے۔ بچے بھی کھیل کود بھول  
 گئے تھے اور سوئمہر محل کے قریب ٹھٹ لگائے ہوئے تھے  
 اُس روز شہر کی گلیاں ورمکانات دل کھول کر راستہ کئے  
 گئے تھے۔ خود سوئمہر محل کی رونق دیکھنے کے قابل تھی۔  
 شاہنہادے وقت معینہ پر سوئمہر محل میں آ کر اپنی اپنی جگہ  
 پر بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ ہر شاہنہادہ کی یہ کوشش  
 تھی کہ وہ دوسروں سے لباس میں جُسن میں، اور تمام خوبوں  
 میں شاہنہادی کی نگاہوں میں بڑھ جائے۔ ہر شاہنہادہ کے

دل میں یہی حسرت تھی کہ شاہزادی اُسے پسند کر لیتی۔  
 خدا خدا کر کے انتظار اور بے چینی کی کٹھن گھڑیاں ختم ہوئیں۔  
 ہر طرف سے شور اٹھا کہ شاہزادی وہ آرہی ہے۔ "سنجو گتا  
 مع چند خواصوں کے زرق برق لباس میں سوئمبر محل کے اندر  
 داخل ہوئی۔ اُسکے زریں لباس اور بیش بہا زیور اُس کے  
 حُسن خدا داد کو اور بھی چار چاند لگائے ہوئے تھے جس وقت  
 نازک اور خوبصورت ہاتھوں میں ہار لئے ہوئے وہ ایک  
 شاہزادے کے پاس سے ہوتی ہوئی دوسرے کے قریب  
 آتی اُس کا دل دھڑکنے لگتا۔ اور وہ دل میں دُعا  
 کرتا کہ کاش مجھ سے آگے قدم نہ بڑھاتی۔ مگر اُن میں سے کسی  
 کو بھی اسکا علم نہ تھا کہ سنجو گتا کے ہاتھ کا ہر کسی اور کی  
 گردن کو ڈھونڈ رہا ہے۔ سب کے سب مَنجُو تھے۔ سنجو گتا  
 جب کسی شاہزادے کے سامنے آ کر کھڑی ہوتی تو اُس کی

خادمہ اُسے تفصیل کے ساتھ شاہزادے کی بہادری کے  
کارنامے سناتی۔ اس طرح شاہزادی مُسکراتی ہوئی آخری  
شاہزادے کے قریب آئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب یہ  
شاہزادہ بازی لے گیا۔ مگر لوگوں کی ٹکٹکی بندھی رہ گئی جب  
انہوں نے دیکھا کہ وہ شاہزادہ بھی اُن سے کچھ کم قیمت  
نہیں ہے۔ شاہزادی تھوڑی دیر ٹھٹھکی اور پھر ادھر ادھر  
نظر دوڑانے لگی۔ گویا وہ کسی اور کو تلاش کر رہی تھی۔

بے چندر اور اُسکے مہانوں میں سے کسی کی سمجھ میں  
یہ بات نہ آئی کہ شاہزادی کا اصل منشا کیا ہے؟ وہ چاہتی  
کیا ہے؟ اُسے جستجو کس کی ہے؟ لیکن اُنکی یہ حیرت بہت  
جلد دور ہو گئی۔ شاہزادی ایک بیک صدر دروازہ کی  
طرف مُڑی۔ اُسکی نگاہیں پرتھوی راج کی اُس مورت پر  
پڑ رہی تھیں جو اس وقت بے چندر کے محل کی درباری کراڑی

تھی۔ سنجوگتا نے تیزی کے ساتھ قدم اٹھایا۔ اور دیکھتے دیکھتے  
 ہار اسی مٹی کی مورت کے گلے میں تھا۔ ٹھیک اسی وقت  
 ایک نوجوان سوار جمع کو چیرتا بھاڑتا سامنے سے نمودار ہوا  
 اور پل مارتے سنجوگتا کو اپنی آغوش میں لے کر گھوڑے پر  
 بٹھایا۔ اور مع اپنے ہمراہیوں کے جو اس کے پیچھے پیچھے تھے  
 گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا یہ جاوہ جانظر سے اوجھل ہو گیا۔  
 یہ بہادر نوجوان سوار پر تھوپی راج کے اور کون ہو سکتا تھا؟  
 قنوج کے بہادر تلواریں تول کر آگے بڑھے۔ چاہتے تھے کہ اس  
 گستاخی کا مزار پر تھوپی راج اور اس کے ساتھیوں کو چکھادیں  
 مگر اٹھوڑ بہادر بھی ان کے مقابلے سے کب بھاگتے تھے۔  
 کھڑے ہو گئے۔ دونوں طرف سے تلواروں کے ہاتھ چلنے  
 لگے۔ مگر سانپ نکل چکا تھا۔ زمین پر لائٹی مارنا بیکا رہتا۔  
 پر تھوپی راج سنجوگتا کو لئے ہوئے یہاں دہلی پہنچ گیا۔

پورے ایک سال تک پرتھوی راج اور سنجوگتا  
 نے دل کھول کر خوشیاں منائیں۔ ایک لمحہ کی جدائی  
 انکے لئے ایک سال ہو جاتی۔ کسی طرح ایک دوسرے سے  
 الگ ہونا گوارا نہ کرتے تھے۔ مگر ان کے اچھے دل انھیں  
 ہونے کو تھے۔

جے چندر کے دل میں پرانی آگ اب بھی سناگ  
 رہی تھی بلکہ اب تو شعلے بھڑک اٹھے تھے پرتھوی راج کی  
 زبردستی اور دلیری اسی نہ تھی جس کو جے چندر ٹھنڈے  
 پلکے برداشت کر لے جاتا۔ حسد اور نفرت نے جے چندر  
 کی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ پرتھوی راج کی دشمنی  
 میں اندھا ہو رہا تھا۔ اس اندھے پن میں اس سے ایک ایسی  
 حماقت سرزد ہوئی جس سے تاریخ کے پڑھنے والے بخوبی  
 واقف ہیں اور جس کی تلافی کسی صورت سے ممکن نہیں۔

اُس نے محمد غوری کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ آئے، دہلی فتح کرے جے چندر بھی اُس کی مدد کے لئے حاضر ہے۔ محمد غوری کے لئے خطِ جنت کے پروانے سے کم نہ تھا۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ راجپوتوں کی باہمی بخشش یقیناً اُس کے لئے فتح کا پیغام ہے۔

ایک مرتبہ تھا میسر کے میدان میں پٹھان فوج بھر آجی۔ جے چندر اپنے راجپوت جوانوں کے ہمراہ دشمنوں میں جا ملا۔ غوری نے اُس کی خاطر مدارات میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مگر پرتھوی راج اور سنجو گت کے لئے یہ خبر تیر و نشتر کا کام کر گئی۔ اُن کی نظروں میں آ جے چندر کی وقعت ایک غدار سے زیادہ نہ تھی جس نے ملک و ملت کو غیروں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ سنجو گت



کو بھلا کب گوارا تھا کہ اُس کا شوہر اپنا فرض ادا کرنے  
 میں کوتاہی کرے۔ اُس نے راتھوڑ بہادر کو جو ابھی مٹیھی منیہ  
 کے مزے لے رہا تھا چونکایا۔ خود اپنے ہاتھوں سے اُسکے  
 ہتھیار باندھے۔ تلوار کمر سے لگائی اور رخصت کر کے  
 کہا۔ ”میرے مالک! میرے غیرت دار سرتاج! اگر تم کامیاب  
 لوٹے تو ہندوستان ہمیشہ کے لئے بچ جائیگا۔ اور دھرم کی  
 لاج رہ جائے گی۔ تمہاری نیک نامی ہوگی۔ وطن کی  
 حفاظت کا سہرا تمہارے سر پہ لگا۔ اور اگر تم لڑائی میں  
 کام آگئے تو ایک بہادر راجپوت کی موت تم کو نصیب  
 ہوگی۔ ملک و ملت کے لئے تمہاری قربانی قابلِ وکار  
 ہوگی۔ ہم تم سو رنگ میں پھر ملیں گے۔ جہاں ہم کو دلی  
 مسرت نصیب ہوگی۔ تمہارا نام ملک کے لئے جان دینے  
 والوں کی فہرست میں سب کے اوپر ہوگا۔ تم جہاں نشاری

اور وقت کی ایک مثال قائم کر جاؤ گے۔ جاؤ اور ملکات سے  
قربان ہو جاؤ۔“

تھانیس سر کی دوسری لڑائی شروع ہو گئی۔ یہ پرتھوی  
راج کا کلیجہ تھا جو آخر وقت تک اس گھمسان لڑائی میں  
قدم جائے رہا۔ مگر آخر کار زخموں سے چور ہو کر گھوڑے  
سے نیچے آ رہا۔ اور ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو رہا۔  
جس وقت سچوکتا کو یہ خبر پہنچی اُس کو کوئی ہراس  
نہ ہوا۔ لبوں پر وہی اگلی سی مسکراہٹ تھی اور چہرے  
سے وہی اطمینان نمایاں تھا۔ اُس نے اپنی سہیلیوں  
کو حکم دیا۔ ”چتا تیار کرو۔“ آگ جب غیب ب بھڑک گئی تو ہنستے  
ہوئے سچوکتا نے اپنے پھول سے نازک جسم کو اُسکے حوالہ کر دیا  
اور اپنے بہادر سترنج سے سوگ میں جا ملی۔  
”قربان ہونے والے کے قربان جائیے“

## پدمنی

تیرہویں صدی کا آخری دور تھا۔ ملک میواڑ ایک  
نوجوان کم سن شاہزادہ لکشمن سنگھ کے زیر حکومت تھا۔  
میواڑ راجپوتانہ میں واقع ہے۔ اس کو لوگ بھادروں اور  
نام آوروں کا دیس کہتے ہیں۔ شاہزادہ بہت کم سن تھا  
سلطنت کا کاروبار سنبھالنا اُس کے لئے سہل کام نہ تھا  
اس لئے اُس کے چچا نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں  
لی۔ شاہزادہ کا نام بھیم سنگھ تھا۔ میواڑ کی راجدھانی چوڑ  
تھی۔ اب تک اُس کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اور اُجڑی ہوئی  
عمارتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ  
بڑا شہر رہا ہوگا۔ بھیم سنگھ نے ایک حسین لڑکی سے شادی  
کی تھی۔ نام اُس کا پدمنی تھا۔ وہ لنگا کے چوہان راجہ مرگھ

کی بیٹی تھی۔ پدمنی اُس کا نام کیوں پڑا؟ کہتے ہیں بڑی خوبصورت تھی۔ اور ایک کھلے ہوئے کنول سے مشابہ تھی۔ اُس کا نام خود ہی اُس کے حُسن کی دلیل ہے۔ اُسکی صورت دیکھ کر لوگ ذنگ رہ جاتے تھے۔ شاعروں کا بیان ہے کہ پدمنی کے حُسن صورت اور حُسن سیرت کی پوری تعریف کرنا محال ہے۔ اُسکی آنکھیں ستاروں کو ماند کر دیتی تھیں۔ اُس کا بدن گلاب سے زیادہ نازک اور ملائم تھا۔ اُس کے دانت موتیوں سے زیادہ خوبصورت اور آبدار تھے۔ اور اُس کے رنگیں ہونٹ یا قوت کو مات کرتے تھے۔ اُس کی سُبک خرامی لوگوں کے دلوں کو پائمال کر دیتی تھی۔ جیب وہ چلیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بٹ پانی کی سطح پر تیر رہی ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ اُس کے دل میں رحم اور خدا ترسی بھی بے انتہا تھی۔ وہ سخی بھی سخی

تھی جس قدر وہ حسین تھی۔

جس زمانہ میں پدمنی کے حُسن و جمال کا چرچا بچہ بچہ کی زبان پر تھا، وہی میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ نام اُس کا سلطان علاء الدین خلجی تھا۔ پدمنی کی خوبصورتی کا شہرہ اُس کے کانوں تک بھی پہنچا۔ درباریوں نے کچھ ایسا شوق ولایا کہ سلطان کے دل میں غائبانہ محبت کا بیج پڑ گیا۔ اور پھر پدمنی کی دُھن ایسی سواہ ہوئی کہ اُس نے طے کر لیا کہ پدمنی میرے حرم میں آکر رہے گی۔ اُس کا دھیان سلطان کو ہر وقت بے قرار رکھنے لگا۔ اُس کی خیالی تصویر سلطان کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ دن کا چینِ خلعت ہو گیا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ محل میں شکار میں تو، یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں بھی بیس ایک خیال تھا اور ایک دُھن۔ وہی ایک رزو

اور وہی ایک فکر۔ کس طرح اُس دُربے بہا کو چتور سے اڑا  
 لاؤں؟ کیونکر اُس کنول کے پھول کو وہاں سے توڑ لاؤں؟  
 کیونکر اُسکی پرستش کروں اور اُس کو اپنے گلے کا ہار بنائوں  
 آخری تدبیر جس پر وہ اب عمل کرنے والا تھا یہ تھی کہ چتور کا مجھ  
 کیا جائے۔ اور اس طرح قلم فتح کر کے پدمنی کو حاصل کیا جا  
 سکے سو اچارہ کاری کیا تھا؟ ادھر سلطان نے فیصلہ  
 سنایا ادھر کوچ کا سامان شروع ہوا۔ چتور کا محاصرہ تو آنا فانا  
 ہو گیا مگر لڑائی نے طول کھینچا۔ چتور پر قبضہ کر لینا بچوں کا  
 کھیل نہ تھا۔ بہادر راجپوت، تھیلی پر سر لئے لڑتے تھے۔  
 اُنھوں نے قسم کھالی تھی کہ ہم آخر وقت تک سر نہ جھکائیں  
 اُن کو عزت زندگی سے کہیں عزیز تھی اُن کے لئے جان پر  
 کھیل جانا آسان تھا۔ مگر اپنی ملکہ پدمنی کو دشمن کے حوالے  
 کرنا ناممکن تھا۔ پدمنی سائے چتور کی آبرو تھی۔ اُسکی حفاظت

اُن کا دین و ایمان تھا۔

آخر کار سلطان کو یقین ہو گیا کہ میری سعی رائگاں  
 ہو گئی اور میری ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اب  
 بحرِ حکمتِ عملی سے کام لینے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اس  
 راجہ کو یہ پیغام بھیجا کہ تم صرف اتنی اجازت دے دو کہ  
 اُس شخص کی دیوی کو ایک نظر دیکھ لوں۔ راجپوت شہر  
 زادیوں میں بھی پردہ کی رسم تھی۔ کوئی انہیں بے حجاب  
 نہیں دیکھ سکتا تھا۔ راجہ نے جواب میں کہلا یا کہ پڑنی سا  
 تو نہ آئے گی ہاں آئینہ کے مقابل رخ کر کے کھڑی ہو جائیگی  
 سلطان محض عکس کی زیارت کرے۔ کشتہٴ محبت سلطان  
 نے اسی کو غنیمت جانا۔ فوراً حامی بھر لی۔ پیغمبرِ سنگ  
 نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اسکی سخاوت تھی جس نے سلطان  
 کے سوال کو رد نہ ہونے دیا۔ بادِی النظر میں تو یہی کہا جاتا

کہ بھیم سنگھ کی مجبوریاں تھیں جو اس سے سب کچھ  
 کر رہی تھیں۔ علاء الدین چند ہمایوں کے ساتھ قلعہ  
 میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر تک آئینہ میں پد مٹی کے رخ  
 بے نقاب سے دل بہلاتا رہا۔ پھر قلعہ سے باہر آنے کا  
 قصد کیا۔ راجہ کی اس خاطر اور ہمدردی کا دل کھول کر  
 شکریہ ادا کیا۔ دستور اور رولج کے مطابق راجہ سلطان  
 کو چند قدم پہنچانے کے لئے قلعہ سے باہر آگیا۔ اسکو خوا  
 میں بھی اس کا گمان نہ ہوا تھا کہ لشکر کے الفاظ میں دغا  
 اپنا کام کر رہی ہے۔ سلطان راجہ کی نوازشوں کے گیت  
 گاتا جا رہا تھا۔ اور راجہ اپنے دل میں سرور ہو رہا تھا۔  
 یکایک سلطان نے رخ بدلا۔ ابرو کے ایک اشارے  
 میں کچھ آدمی دوڑے اور راجہ کو حراست میں لے لیا۔ وہ  
 آدمی پہلے سے اس کام پر تعینات کر دئے گئے تھے۔



راجہ نے بھی تلوار کھینچ لی۔ چاہتا تھا کہ سلطان  
 کو بہادری کے جوہر دکھائے۔ مگر اکیلا دم کہاں تک لڑتا۔  
 آخر مغلوب ہو گیا۔ پٹھان اُس کو قید کر کے دہلی لے گئے  
 بھیم سنگھ کی مہاں نوازیوں کا سلطان کی طرف  
 سے یہ بدلہ دیا گیا۔ احسان فراموشی ہے تو بدترین گناہ  
 مگر افسوس عشق نے سلطان کی عقل پر پردہ ڈال رکھا  
 تھا۔ پدمنی کی محبت میں وہ اندھا ہو رہا تھا۔ اُسے نیک  
 و بد کی کوئی تمیز نہ رہی۔ اور کلنک کاٹیکا اُسکی پیشانی  
 پر لگا کر رہا۔

جب یہ وحشت خیرِ خیر پھیلی تو چچور کے لوگ تمللا  
 گئے۔ اور پدمنی کے صدمہ کی تو کوئی انتہا نہ تھی  
 دُنیا اُس کی نظروں میں تیرہ و مار ہو گئی۔ سلطان نے بھی  
 ایک پل صنایع نہ ہونے دیا۔ پدمنی کو پیغام بھیجا۔ ”راجہ

کی خیر چاہو تو خود کو سلطان دہلی کے حوالہ کر دو۔“

پدمنی بھی راجپوت تھی۔ غیرت جوش میں آئی  
مگر کہہ ہی کیا سکتی تھی؟ اس ستا خانہ پیغام پر چہیں چہیں  
ہو کر رہ گئی۔ مگر وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی ذلی و ذہین بھی  
تھی۔ غور کرنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح سلطان کو ترک دینا  
چاہئے۔ اُس نے اپنے چچا گورا اور اُس کے بھتیجے بمل  
کو طلب کیا۔ رد و کہ کے بعد یہ بات طے پا گئی کہ راجہ کی  
رہائی بھی ممکن ہے اور اس میں پدمنی کی زندگی اور اُسکی  
عصمت و عفت بھی محفوظ رہے گی۔

جب تمام کارروائیاں مکمل ہو گئیں تو اُس نے  
سلطان کو جواب میں کہنا یا کہ ”میں سلطان کے محل میں  
آنے کو تیار ہوں۔ شرط اتنی ہوگی کہ دہلی تک میٹرڈولہ  
اُسی شان کے ساتھ جائے جو ایک شاہنشاہی کے لئے

موزوں ہو۔ اُسکی لونڈیاں بانڈیاں اور اُس کے اپنے  
 ہی آدمی ساتھ ہوں گے۔“ اس نے یہ شرط بھی پیش کی  
 کہ ”کوئی متنفس اُس کے پاس تختیہ میں آنے کی جرأت  
 نہ کرے۔“

جب یہ خوش خبری سلطان کو ملی وہ مائے نوشی  
 کے اچھل پڑا۔ وہ اپنے کو بے حد خوش قسمت تصور  
 کرنے لگا کہ پدمنی اس آسانی سے اُس کے دام میں  
 آگئی۔ وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ پدمنی کو حاصل کر لینا  
 آسان نہیں ہے۔ ابھی اُسے نہ جانے کیا کیا زحمتیں برداشت  
 کرنا ہوں گی۔ اُس نے جھٹ پدمنی کے پاس کھلا بھیجا کہ  
 ”بہ سو چشم تھاری شرائط کو منظور کرنا ہوں۔ بھاری اور  
 تھکائیے آدمیوں کی حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں۔ او  
 جس شان و شوکت سے چاہو وہی چلو۔ پدمنی نے ادھر

مطلبن ہو کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سات سو ڈولے حاضر  
 کریں جس پر نہایت بیش قیمت اور خوب صورت پرے پڑے  
 ہوں۔ جب ڈولے آگئے تو ہر ڈولے میں چتورے کے ایک نمونہ  
 بہادر کو اس میں بٹھایا۔ اور ہر ڈولے کو چھ مسلح سپاہی کھار  
 کے بھیس میں دہلی کو پہلے۔ خود محل میں بیٹھی اپنی انوکھی تیر  
 کی کامیابی کا انتظار کرنے لگی۔

جب سلطان نے ڈولوں کے اتنے بڑے جلوس کو آتے  
 دیکھا تو پھولا نہ سما یا۔ دل مائے خوشی کے بانسوں اُچھلنے لگا۔  
 وہ اب اس کا منتظر تھا کہ پدمنی کب میرے خیمہ کو اپنے قدموں  
 فرودن بناتی ہے۔ پالکیاں کہیں تک آئیں اور ٹھہریں۔  
 اب ایک آخری منہا تھی جو پدمنی کی طرف سے سلطان کی خدمت  
 میں پیش ہوئی وہ یہ تھی کہ اب میں اپنے پہلے شوہر پریم سنگھ  
 سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا چاہتی ہوں اُسے آخری بار

ایک اور صرف ایک نظر دیکھ لینے کی اجازت دے دی جا  
 سلطان کو کسی قسم کے دھوکے اور فریب کا گمان بھی نہ تھا  
 اُس نے یہ درخواست منظور کی۔ بھیم سنگھ کو نصف گھنٹہ تک  
 پدمنی سے گفتگو کرنے کا موقع دیا گیا۔ راجہ ایک پالکی میں  
 داخل ہوا جو سب کی آنکھوں میں خاک جھونکے دہلی سے  
 چتور رخصت کر دی گئی۔ بقیہ جیوں کی تیوں ٹھہری رہیں۔  
 سلطان کو اب انتظار کی تاب نہ رہی نصف گھنٹہ سے زیادہ  
 ہو چکے تھے۔ اب اُسے کچھ شبہ پیدا ہوا کہ غالباً یہ کوئی نئی چال  
 ہے۔ پدمنی کی پالکی کی طرف لپکا کر وہاں کیا تھا، ایک مسلح  
 بہادر راجپوت۔ تعاقب ہوا مگر بے سود۔ راجپوت ایک  
 کر کے خون میں لٹنے لگے مگر اتنا موقع نہ دیا کہ سلطان کے  
 سپاہی راجہ کو پھر گرفتار کر لیں۔

راجہ ایک برق دم گھوڑے پر قراٹے بھرتا چتور کی

طرف اڑا جا رہا تھا سلطان کے آدمی بھی پیچھا کرنے کے  
 لئے دوڑے۔ اور راجہ سے چند ہی قدم کے فاصلہ پہنچتے  
 کہ راجہ اپنے قلعہ کی پناہ میں آگیا۔ نا اُمید و نا کام سلطان  
 کو آن کر خبر دی۔ سلطان غصہ میں آگ بگولا ہو گیا اور ایک  
 مرتبہ پھر چٹور کا محاصرہ کر لیا۔ پھر گھمسان مگر مختصر جنگ ہوئی  
 گورا پد سنی کا چچا جو ہر مردانگی دکھاتا ہوا قتل ہوا۔ دونوں  
 طرف بے شمار جانیں تلف ہوئیں۔ گورا کی بی بی نے شوہر  
 کے قتل کا حال سنا تو بے حد خوش ہوئی۔ وہ بدل کی  
 زبانی یہ سن کر بے حد مسرور ہوئی کہ گورا بہتیروں کوتلو اے  
 گھاٹ اُتار کر قتل ہوا۔ اور پھر دستور کے مطابق مع چند  
 عورتوں کے اپنے جسم کو آگ کی نذر کیا۔ آگ میں کودتے  
 کودتے کہتے بھی اُس کی زبان سے یہی نکلا ”میرا شوہر  
 میرا منظر ہوگا۔“ علاء الدین اپنی بقیہ شکست خوردہ

فوج کو لے کر بھاگ بکھڑا ہوا۔

سالہا سال گزرتے گئے۔ مگر سلطان کی محبت کی  
 آگ اُسی طرح بھڑکتی رہی۔ وہی چاند سا گھڑا دن رات  
 اُس کی آنکھوں میں پھرتا رہا۔ اُسے کسی جگہ کسی گھڑی قرار  
 نہ تھا۔ آخر کار اُس نے چتور کے محاصرہ کی پھرتیاری کر دی  
 ابھی راجپوت پچھلے نقصانات کی تلافی نہ کر سکے تھے کہ  
 پھر وہی مصیبت سر پٹ گئی۔ جس آفت سے نجات ملی تھی  
 اُسی میں پھر مبتلا ہو گئے۔ باوجود جان توڑ کوشش کے راجپوت  
 اس مرتبہ تاب مقاومت نہ لاسکے۔ راجہ نے بہتیری تدبیریں  
 کیں مگر بے سود ثابت ہوئیں۔ راجپوت بہادر ایک ایک  
 کر کے تلوار کی نذر ہوتے گئے۔ خود راجہ کے گیارہ بڑے اس  
 مشہور جنگ میں کام آئے۔ صرف ایک لڑکا بچ رہا تھا۔  
 مجبور ہو کر راجہ نے زور لباس زیب تن کیا۔ یہ نشانی تھی فتح کی

یاموت کی - راجہ زن میں آگیا اور داد مردانگی دیتا ہوا  
دُنیا سے رخصت ہوا۔

پدمنی فصیل پر کھڑی جنگ کا سماں دیکھ رہی تھی  
جب اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ نہ راجپوت رہ گئے اور  
نہ راجہ تو اپنی سہیلیوں سے کہا "اب جیٹا بے کار ہے۔"

بے غرتی کی زندگی سے موت کہیں بہتر ہے۔ آؤ! ہم لوگ بھی چپو  
کی تاریخ میں اپنا نام کر جائیں جب سلطان ہمارے آدمیوں کو  
قتل کر کے چور کے قلعہ میں داخل ہو تو سو اسے آگ کے شعلوں

اور خاک کی ڈھیر کے اُسے کچھ ہاتھ نہ آئے۔ یہ مختصر سی تقریر

تھی جس نے ساری عورتوں کے خون میں حرکت پیدا کر دی

جتا تیار ہوئی اور عورتوں کا جلوس آگ میں کودنے کے

لئے آگے بڑھا۔ پدمنی نے دوبارہ عورتوں کو مخاطب کیا

کہا "تم میں سے جس کو عزت سے جان پیاری ہو وہ میرے پاس



ساتھ نہ آئے۔ پیچھے ٹھہری رہ جائے۔ مگر کون عورت تھی جو پدمنی کے ہم خیال نہ تھی۔ سب نے پدمنی کا ساتھ دیا۔ پھول سے نازک جسم شعلوں کی نذر ہو گئے۔ اس طرح ”جوہر کی رہم ان راجپوت عورتوں نے ادا کی۔

سلطان فتح کے شادیاں بجاتا قلعہ میں بہ حیثیت فاتح کے داخل ہوا۔ اُس وقت سلطان کی منگیں بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ آج ایک مدت کی حسرت نکلے گی۔ پدمنی سے دل کھول کر ملیں گا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ پدمنی اس طرح بچ نکلے گی۔

جب وہ آگ کے شعلہ سے دوچار ہوا تو اُسے جلنے والیوں کے حال پر ترس آ گیا۔ تھا تو بے حد سخت دل مگر اس دردناک منظر کی وہ بھی تاب نہ لاسکا۔ اُس نے

اپنے آدمیوں کو روک دیا اور حکم دیا کہ پڑھنی کا خوبصورت  
 محل یوں ہی بننے دیا جائے۔ اسے مسمار نہ کیا جائے  
 چنانچہ وہ محل اب تک جھیل کے کنارے جاں باز رہی  
 کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔



## (۷) اہلیہ بائی

اب تک تمام کہانیوں میں ان بہادر اور جبری عورتوں کی  
 یاد تازہ کی گئی ہو چکے کارنامے تاریخ کے صفحات پر پھنسے حروف  
 میں اس طرح منقوش ہیں کہ زمانہ آنکو کبھی مٹا نہیں سکتا۔ ان  
 عورتوں نے اپنے اور اپنے ملک کے بدخواہوں کے مقابلہ میں  
 خدا داد جرات اور دلیری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ آخری  
 کہانی بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ یہ ایک پاکیزہ اور پاک طینت  
 رانی کا قصہ ہے جس کا نام ”اہلیہ بائی“ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس  
 رانی نے کوئی جنگی مہم نہیں سر کی۔ مگر جس امن و صلح اور سلیقہ  
 کے ساتھ ”اہلیہ بائی“ نے اپنی سلطنت کی دیکھ بھال کی، وہ  
 تاریخ میں قیامت تک یادگار رہے گا۔ اسکی شہرت اس کے  
 حسن انتظام ہی کے باعث ہوئی۔ مغرب کے مشہور شاعر

ملٹن کا قول ہے کہ "اس من امان کے ساتھ فتح کی شہرت جنگ  
 کی فتوحات کی شہرت سے کچھ کم نہیں ہوتی۔" اس سے اہلیہ  
 بانی کی تاریخی شہرت ملٹن کے خیال کی تائید کرتی ہے۔  
 اہلیہ بانی ایک غریب گرمغز گھرانے کا چشم  
 و چراغ تھی۔ باپ کا نام آتندر اوسیندھیہ تھا۔ جو  
 ایک معمولی کسان تھا۔ چند بیگے کھیت پر اُس کی اور اُسکے  
 اہل و عیال کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ ہاں اُس کو یہ  
 فخر ضرور حاصل تھا کہ وہ سندھیہ کے مشہور شاہی خاندان  
 سے نسبت رکھتا تھا۔ ایک زمانہ تک اُس کو اولاد کی  
 حسرت رہی اور پوری نہیں ہوئی۔ مگر ۳۵ء میں اُسکی  
 مراد برآئی اور اُسکے گھر کو خدائے ایک بچی سے گلزار کر دیا۔  
 اس بچی کا اہلیہ دیوی کے نام اہلیہ بانی رکھا گیا  
 اہلیہ دیوی گوتم رشی کی بیوی تھی۔ گوتم رشی ہندوستان

کے اُن سات مشہور شیوں میں سے تھے جن کا نام بڑے  
احترام اور تعظیم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

اہلیہ بانگی میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو  
ایک ہندو لڑکی کے نمایاں ہیں طبیعت میں سادگی اور  
دل میں رحم اور خدا ترسی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ خیرات  
اور غریب نوازی، عبادت اور بندگی کا سبق اُس نے  
اُن قصوں اور کہانیوں سے حاصل کیا جو اُس کے ماں باپ  
اُس کو سنایا کرتے تھے۔ اسی ابتدائی تعلیم نے اُس کے دل  
میں ہمدردی، خلوص، قوم پرستی اور حب وطن کے  
بیج ڈالے۔

اس کی شادی کا واقعہ بھی عجیب و غریب تھا  
راؤ ہلکر ایک مرہٹہ سردار تھا۔ اتفاقاً اُس کا گزر اُس علاقہ  
میں ہوا جہاں اہلیہ بانگی رہتی تھی۔ اُسکی عمر نو سال سے

زیادہ نہ تھی۔ فوج کی آمد کا غل سنا تو جیسا کہ بچوں کی عادت ہے  
 دیکھنے کے لئے دوڑی۔ مگر ٹھہر کر پر اسکی سادگی اور اس کے  
 معصومانہ انداز نے جادو کا اثر کیا۔ اس کا دل بے اختیار اہلیہ  
 بانی کی طرف کھنچا اور اس نے شفقت پوری کے ساتھ اہلیہ  
 بانی کو گود میں اٹھالیا بڑی دیر تک پیار کرتا رہا۔ وہیٹ الہ  
 سے دریافت کیا لڑکی کس کی ہے؟ جب معلوم ہوا کہ سندھیا  
 خاندان کے معزز گھرانے کی بیٹی ہے تو اس نے اس پر راضی و طلب  
 کیا اور اس سے کہا میں اہلیہ بانی کو اپنے رُکے کی دُھن  
 بنا ناچاہتا ہوں کیا تمہیں بھی یہ رشتہ منظور ہے؟ غریب کیان کی  
 خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ طہار راؤ کی زبان سے رشتہ کی آواز  
 اس کو خواب و خیال کی بات معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تو اسکی  
 سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ مگر جب ہلکے زانپتی آواز کا  
 دوبارہ اظہار کیا تو وہ اسے خوشی کے پھولانہ سمایا۔ اس نے ہلکے کو

ہزاروں عائیں دیں۔ اُس نے جو احسان کیا غے کیسا ان پر کیا تھا  
اُسکا بدلہ ناممکن تھا۔ شادی کی خوشیاں اعلیٰ پیمانہ پر منائی گئیں اور  
تمام پوربئی رسمیں ادا کی گئیں۔ ”ورالہیہ بائی“ دو گھنٹے تک اپنے شوہر  
کے گھر آئی۔

اپنی سعادتمندی اور خوش سلیقگی کی بدولت الہیہ بائی سسرال  
میں سب کو عزیز تھی۔ اُس نے ساس۔ سسر اور شوہر سب کا دل موہ لیا  
”ہلکے بڑا تنکے“ آج تھا۔ بہت جلد جامہ سے باہر ہو جاتا تھا۔ ”ورالہیہ بائی“  
غلطی معمولی سی خطا اُسکے مزاج کو برہم کر دیتی تھی۔ مگر الہیہ بائی  
کی شیریں کلامی اور نرمی ”ہلکے“ کے غصہ کو بہت جلد ٹھنڈا کر دیتی تھی  
اُسکی محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ ”الہیہ بائی“ نہ صرف خانہ داری کے  
انتظام کی نگرانی کرتی تھی بلکہ دوسروں کا ہاتھ بھی بٹالیتی تھی  
قاعدہ ہے کہ فلاکت کی سختیاں جھیلنے کے بعد عیش و عشرت کا  
زمانہ انسان کو مغرور بنا دیتا ہے۔ الہیہ بائی اس عیب سے پاک تھی۔

جاہ و ثروت پانے کے بعد بھی اُس میں ہی سادگی و سہمی  
معصومیت اور وہی ہندو سی تھی۔ وہ معمولی گھرانوں کی عورتوں  
کی طرح اپنے ہاتھ سے گھر کا کام دھند کرتی تھی اور بیجا نزاکت  
و نفاست کو کبھی راہ نہیں دیتی تھی۔

شادی کے نو سال بعد اہلیہ بانی کی قسمت نے پٹا کھایا  
اہلیہ بانی کا پیارا شوہر ایک جنگ میں کام آگیا۔ اور اُسے  
زندہ آپے کی کٹھن گھڑیاں کاٹنے کے لئے چھوڑ گیا۔ زمانہ کی سم  
کے مطابق اُس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ شوہر کے ساتھ سستی ہو جائے  
مگر بوڑھے اور ضعیف ہلکے نے آبدیدہ ہو کر کہا بیٹی! ایک ہی  
پتھر تھا جو داغ دے گیا۔ بقیہ زندگی کا سہارا لے دے کر تو تھی  
جو اب ساتھ چھوڑنے پر تکی ہے۔ اگر ایسا کیا تو اس بڑھے کا خدا  
حافظ ہے۔ میری سن! بڑھے کی بے کسی پر ترس کھا اور اپنے  
ارادہ سے باز آجا!۔“ بوڑھے ہلکے پر دردِ التجا سے اہلیہ بانی



کا عزم و استقلال کمزور پڑ گیا۔ اُس نے سوچا کہ مُردہ سے زیادہ زندہ قابلِ توجہ ہے۔ بڑھے سسر کا دل توڑنا اچھی بات نہیں۔“

اُس گھڑی سے اہلیہ بانی نے ہلکے کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ امورِ سلطنت میں اہلیہ بانی ہلکے کا زبردست ہاتھ بنتا ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں جب ہلکے پانی پت کی جنگ میں شریک ہونے گیا تو سلطنت کا کام اہلیہ بانی کے سپرد کر گیا۔ جب واپس آیا تو اہلیہ بانی کے انتظام سے سجدِ غُوش ہوا۔ کہیں کسی قسم کی خرابی نہیں پائی گئی۔ اُس نے اہلیہ بانی کو بڑی شایستگی دی اور اُس کا دل بڑھایا۔

۱۹۷۹ء میں ہلکے کو نیا سے رخصت ہوا۔ اہلیہ بانی کا کلم سن بچہ راج پاٹ کا مالک بنے۔ مگر وہ بیوقوف اور نا عاقبت اندیش ثابت ہوا۔ رعایا سختی سے عاجز رہی اور درباری اسکی

بدسلکیوں سے بظن تھے۔ ریاست کی خوش قسمتی تھی کہ موت نے اُس کم سن اور ناقص عقل راجہ کا خاتمہ کر دیا۔

اب اہلیہ بانی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی پیشوا نے بھی سند عطا کر دی چونکہ کوئی مرد نہ تھا۔ گدی کی مالک بنتا وہی قرار پا گئی۔ رکھونا تھا راؤ پیشوا کا چچا تھا جس کی آگ اُس کے دل میں بھڑک اُٹھی اُس نے مخالفت کی اور چڑھائی بھی کی۔ مگر رعایا اہلیہ بانی کو ”دیوی“ سمجھتی تھی۔ تلوار تول کر مقابلہ پر آ گئے اور رکھونا تھا راؤ کے دانت کھٹے کر دئے۔ اُس نے من مان کیسا پورے تیس سال حکومت کی۔ ایک انگریز مورخ کو اس بات کا اعتراض ہے کہ اہلیہ بانی کی حکومت اُسی حیرت انگیز تھی۔ ”اندوڑا ایک معنی لی قصبہ تھا۔ اہلیہ بانی نے اُسے ترقی دیکر ایک شہر بنادیا۔ اُسکی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ ملک غمے شحال ہو جائے۔ خود تکلیفیں اُد زحماتیں برداشت کیں مگر مالوہ میں من قائم کر دیا۔ نہ صرف اُسکی

رعایا اسکی ہمدردی اور رحم سے مستفید ہوتی تھی بلکہ جنگل کے  
جانور، ہوائیں اُڑنیوالی چڑیاں، دریا کی مچھلیاں سبھی اسکی داد و تحسین  
اور فیض رسانی سے پورا فائدہ اُٹھاتی تھیں۔

ہندوؤں میں خیرات ہی تمام نیکیوں کی اصل بتائی گئی ہے  
ایلیہ بانی کو سب ہی "تصور کرتے تھے۔ وہ مجسم سخاوت تھے۔ اس  
پاک پاتن عورت نے تمام ہندوستان میں مندر اور دھرم شالے بنوائے  
گیائیں "وشنوجی" اور بنارس میں "شیشتر" کا مندر اسکی یادگار ہیں۔  
ان تمام مذہبی امور میں بے حساب دولت صرف ہوئی مگر گھار  
راؤ کا خزانہ خالی ہونے والا نہ تھا۔ خزانہ سے غریب کو کھانا اور کپڑا  
دیا جاتا تھا۔ محتاج ساری سلطنت میں ڈھونڈھے نہ ملتے  
تھے۔ "وندھیا" کی پہاڑی وادیوں و درویشوار گزار راستوں  
پر ایک شکر نکالی جس سے آمد و رفت آسان ہو گئی۔ عوام کی  
خیر اندیشی نے رعایا کو ایلیہ بانی کا گرویدہ بنا دیا۔ اس کے

خلاف بغاوت کا خیال لوگ گناہ سمجھنے لگے تھے۔ کوئی اُس کی حکومت سے نالاں نہ تھا۔ وہ اپنے کو اپنے رعایا کی خدمت گزار سمجھتی تھی۔ قصع اور تکلف کو پاس پھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ اُس کا ہر قدم رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے اٹھتا صبح شام رعایا اور سلطنت کی بہبود ہی کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ مشرق یا مغرب کے سلاطین میں اس کی نظیر ملنا بہت دشوار ہے۔ پاک باطنی اور سادگی میں وہ سلطان ناصر الدین کی ہمسر تھی۔ مذہبی آزادی میں "اکبر" کی، اور رحم اور سخاوت میں "آشوک" کی ہم قدم تھی۔

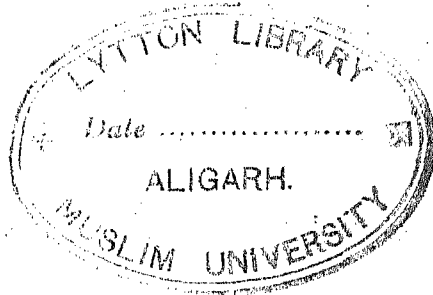
سرجان مالک نے متعدد واقعات اُسکی بہدروی کے بیان کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رعایا کی بھلائی کا اسے بے حد خیال تھا۔ انصاف کا خون کبھی روا نہ رکھتی تھی۔ مقدمات کا فیصلہ کرنے میں جانبداری کو راہ نہ دیتی تھی۔

ایک امیر سا ہو کار قضا کر گیا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جائیداد ریاست نے ضبط کر لی۔ سا ہو کار کی بیوی نے اہلیہ بانی کی خدمت میں عرضی بھیجی۔ اہلیہ بانی نے ساری ملکیت سا ہو کار کی بیوہ کو واپس کر دی۔ اپنے ملازموں اور کارکنوں کو رعایا پر ناجائز سختی کرنے سے روکتی رہتی تھی۔ اس طرح کے سیکڑوں سلوک تھے جنکی بدولت اب تک اُس کا نام زندہ ہے۔ اور لوگ اُس کی پرستش کرتے ہیں۔

اُس کی روزانہ زندگی کے واقعات پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بہت پرہیزگار، منصف مزاج، او سادہ لوح تھی۔ علی الصبح اُٹھتی، نہاتی، عبادت کرتی پھر بیکوں اور غریبوں کو شکم سیر کھانا کھلاتی اور خیرات تقسیم کرتی۔

خود اُس کی غذا بالکل سادہ تھی۔ گوشت تو چھوٹی نہ  
 تھی۔ دو بجے دربار لگتا تھا۔ اہلیہ بانی صبر اور استقلال  
 کے ساتھ مقدمات کو سنتی اور نہایت متانت اور سنجیدگی  
 کے ساتھ فیصلے سناتی۔ دربار چار بجے تک لگا رہتا۔ کوئی  
 کام کل پر نہ چھوڑا جاتا۔ چھ بجے عبادت خانہ میں چلی جاتی  
 وہاں سے فراغت پا کر کھانا کھاتی جو بالکل سادہ ہوتا۔ اسکے  
 بعد وزراء کے مشورہ سے خفیہ معاملات کو طے کرتی۔ یہ تھے  
 اہلیہ بانی کے عادات حسنہ اور یہ تھے اُسکے اخلاق حمیدہ  
 دربار میں ہوتی یا گھر میں کسی کے ساتھ ترش روئی  
 سے پیش نہ آتی۔ ہاں جب کسی بد معاش کو سزا دینا مقصود  
 ہوتا تو البتہ غصہ کا اظہار کرتی۔ اُس کے بعد پھر غصہ کی کوئی  
 علامت باقی نہ رہتی۔ وہی متانت وہی سنجیدگی پھر  
 چہرہ سے ٹپکنے لگتی۔

خوشامد سے اہلیہ بانی کو نفرت تھی۔ سر مالک کہتا ہے  
 ”اہلیہ بانی اُن عورتوں میں سے تھی جن میں غرور اور خود  
 نمائی کا مادہ بالکل نہیں ہوتا۔ اُس کے حسن سیرت کا پورا  
 مرقع پیش کرنا دشوار ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کی  
 نظیر دنیا کے پرہیزگار اور ضرب المثل حکمرانوں میں مشکل سے  
 ملے گی۔“







Kam Babu Saksena Collection.

२२१  
(८०)

१५.५.५८

**DUE DATE**

२२ ५.१

Ram Babu Saksena Collection.

२२१

१२.३.४१

(३४)

२२४.१

Date	No.	Date	No.

